المنار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ۝ (اعراف)

"بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منار بلند تر محکم افتاد"

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

علم و عمل

سرپرست: صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب
مدیر اعلیٰ: ارشد ترمذی

نگران: چوہدری محمد شریف خالد
مدیر: رشید احمد جاوید

اپریل، مئی، جون سنہ ۱۹۶۲ء

جلد ۱۲ — شمارہ ۵

پرنٹر و پبلشر: جنید ہاشمی — مطبع: ضیاء الاسلام پریس — سرورق: نصرت آرٹ پریس
ربوہ

مُندرجات

(۱) اِدارِیہ

(۲) مقالات ومضامین :

عطاء المجیب راشد، اعجاز الحق قریشی، اقبال نجم،
پروفیسر حمید اللہ ظفر، مرزا محمد رفیق،
بشارت الرحمن، مولانا ابوالعطاء، ڈاکٹر محمد رمضان، منیر فرخ

(۳) تعارفات : ربوہ کے تعلیمی ادارہ جات، قادیان کی تعلیمی حالت۔

(۴) تبرکات : حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ، حضرت امام جماعت احمدیہ

(۵) منظومات : [redacted]، فیض احمد اسلم،

(۶) غزلیات :

چوہدری محمد علی، محمد ظہور الدین اکمل، روشن دین تنویر
ارشد ترمذی، خالد ہدایت، مصلح، پروفیسر ضمیر احمد خان

(۷) افسانہ : زرتشت منیر،

(۸) حِصّۂ عربی : کَلامُ الْاِمام اِمامُ الْکَلام،
عطاء المجیب راشد، رشید احمد جاوید

اِدَارِیَہ

نیا آئین

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کا دن تاریخ پاکستان میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس دن ہمارے ملک نے تاریخ کے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ پاکستان آزاد اسلامی جمہوریہ کہلانے لگا۔ اور ملک کو ایک "عظیم آئین" دیا گیا۔ ایک ایسا آئین کہ جسکے ساتھ ملکی اور قومی بقا کی بے شمار اُمیدیں وابستہ کی گئیں۔ جسکی بنا پر خیال کیا گیا تھا کہ قوم مضبوط ہوگی۔ ملت میں ایک صحت مند فضا جنم لے گی، ملک ترقی کرے گا! اور مستقبل تاباں اور درخشاں ہوگا۔ مختصراً یہ کہ ۲۳ مارچ کا دن ملک کی ہمہ گیر ترقی کا ایک حسین اور دلفریب خواب تھا۔ مگر افسوس ہم نے اس مبارک دن کی قدر نہ کی، اور خواب کو خواب رہنے دیا۔ اے کاش! ہماری عزتیں، ہمارے مال، ہماری جانیں اور ہمارے اوقات اِس خواب کی کوئی حقیقت پسندانہ تعبیر ڈھونڈ سکتے۔ اڑھائی سال ہم نے آئین کی نعمت کا مذاق اُڑایا۔ قومی مفاد کے ساتھ خون کی ہولی کھیلی۔ ملکی وقار اور استحکام کا منہ چڑھایا۔ تب یہ مذاق اور ہولی ۱۹۵۸ء کے انقلاب کی علت الغائی ٹھہرے۔ انقلاب ہمیشہ مفید ثابت نہیں ہوتے۔ لیکن خدا کا شکر ہے ہمارے انقلاب کے پیچھے خود غرض عنصر کی بجائے دردمند دل کام کر رہے تھے۔ مستقبل کا مؤرخ ان قلوب کی بے لوث خدمت، بے غرضانہ قربانی و ایثار اور زبردست اصلاحی کام کو ضرب المثل کے طور پر بیان کرے گا۔ اور قوم کے لیڈروں سے اُس قومی درد اور حب الوطنی کا مطالبہ کیا جائے گا جس کا مظاہرہ ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد کیا گیا۔

یکم مارچ ۱۹۶۲ء کا دن قومی تعمیرِ نو کیلئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اُس دن صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے قوم کے سامنے ایک ایسا آئین پیش کیا جس کو بلا خوفِ تردید ایک "کارنامہ" قرار دینا چاہیئے۔ کوئی تخریب پسند ہمارے ان الفاظ کو خوشامد اور مصلحت پرستی سے تعبیر کر سکتا ہے۔ لیکن ایک باہوش انسان کیلئے ایسا کہنے کی گنجائش نہیں بلکہ وہ ہمارے الفاظ میں حقیقت کی چاشنی پائے گا۔ آئین تو ہر حکومت کا لازمہ ہے اور کوئی حکومت بغیر آئین کے صحیح معنوں میں حکومت نہیں کہلا سکتی۔ ہماری حکومت نے بھی ایک آئین بنایا ہے۔ لیکن اسے کارنامہ کیوں کہا جائے؟ اِس سوال کا جواب یہ ہو کہ آئین کی بعض اقدار ہوتی ہیں۔ وہ محض خوبصورت اور دلکش دفعات یا چند رنگین اُصولوں اور نظریات کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ آئین کی حقیقی رُوح یہ ہو کہ وہ حالات کے مطابق ایک لائحہ عمل تجویز کرے۔ ہمارا موجودہ آئین حالات کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اور یہ وہ سب سے بڑی خصوصیت ہے نئے آئین کی جسکی بنا پر ہم اسے کارنامہ

قرار دیتے ہیں۔ انفلوئنزا کیلئے ٹائیفائڈ کی دوائیاں تجویز کرنا کسی طرح بھی ایک دانشمندانہ اقدام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر کوئی نیم حکیم انفلوئنزا کے آثار کو ٹائیفائڈ کی علامات پر محمول کرتا ہے تو یہ اُس کی حماقت ہے۔ مجوزہ علاج صحت دینے کی بجائے زندگی لینے کا سبب بن جائیگا۔ اس سے اصل بیماری ختم ہونے کی بجائے نہ صرف خود پیچیدہ ہو جائے گی، بلکہ غلط علاج سے ممکن ہے بعض اور خطرناک قسم کی بیماریاں بھی پیدا ہو جائیں۔ ظاہر ہے یہ اقدام بالآخر مُہلک ثابت ہوگا۔ نیا آئین حکومت کا ایک نہایت ہی دانشمندانہ اقدام ہے جس کی داد دینی چاہیئے۔ ایک زرّیں کارنامہ ہے جس کے لئے حکومت بجا طور مبارکباد کی مستحق ہے۔ ایک قابلِ اعتماد نسخہ ہے جو حالات کی عمیق تشخیص کے بعد تیار کیا گیا ہے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اور سوال کا جواب بھی دیدیا جائے۔ یعنی اس امر کی کیا دلیل ہے کہ موجودہ آئین حالات کے تقاضوں کو پُورا کرنے والا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ملکی حالات کے تقاضوں کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ اوّل یہ کہ متعلقہ ملک کے دُوسرے ملکوں سے کیسے تعلقات ہیں اور کیسے ہونے چاہئیں۔ دوم یہ کہ ملک کی اندرونی فضا کیسی ہے؟ ان دونوں حالات کا جائزہ لینے اور موازنہ کرنے کے بعد یہ سوچا جائے گا کہ آئین کی نوعیت کیا ہو؟ لچکدار ہو، یا غیر لچکدار۔ طرزِ حکومت پارلیمانی ہو، یا صدارتی۔ ایک کامیاب موازنہ ہمیں بتائیگا کہ حکومت کے کس شُعبہ میں کہاں کمزوری واقع ہے اور اسے کس طرح دُور کیا جاسکتا ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ ہمارے آئین میں اس موازنہ سے کس حد تک فائدہ اُٹھایا گیا ہے؟

جہاں تک موجودہ حالات میں ہماری بیرونی پوزیشن کا تعلق ہے۔ ہمارے لئے از حد ضروری ہے کہ ہم مُلک میں ایک پائیدار حکومت قائم کریں جس پر غیر ملکی حکومتیں اعتبار کرسکیں۔ جو حقیقی معنوں میں بین الاقوامی معاملات میں ہمارے مُلک کی نمائندگی کرسکے۔ آج کل معیشت اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر مُلک اس کوشش میں ہے کہ وہ معاشی اُستحکام کی دوڑ میں اگر تمام دُنیا سے نہیں تو کم از کم مدِّ مقابل ممالک سے تو ضرور آگے نکل جائے۔ یہ چیز ایک حقیقت بن چکی ہے کہ ایک مضبوط معیشت کسی ملک میں مضبوط سیاسی نظام کی نہ صرف ضامن ہے بلکہ آئینہ دار بھی ہے۔ دُوسری طرف جس قدر کسی ملک کا سیاسی نظام مضبوط ہوگا، اُسی قدر وُہ دُوسری حکومتوں، تنظیموں اور بین الاقوامی ترقیاتی اداروں سے زیادہ سے زیادہ امداد حاصل کرسکتا ہے۔ مضبوط حکومت بیرونی سرمایہ کو کھینچتی ہے اور کمزور حکومت سے بیرونی سرمایہ دُور بھاگتا ہے۔ پس غیر ملکی حکومتوں میں اعتبار اور اعتماد پیدا کرنا ملک کی فلاح و بہبود کے لئے بہت ضروری ہے۔ پاکستان ابھی ایک پسماندہ ملک ہے اور اس کے معاشی استحکام میں کئی دیواریں حائل ہیں۔ اور یہ صرف اسی صورت میں دُور ہوسکتی ہیں جبکہ مُلک میں ایک مضبوط اور پائیدار حکومت قائم ہو۔ نیا آئین ہمیں ایک پائیدار صدارتی طرزِ حکومت کا وعدہ دیتا ہے۔ اور یہ حالات کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

اسی ضمن میں دُوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسوقت

پاکستان کے بعض پڑوسی ممالک کا رویّہ بہت غیر دوستانہ اور غیر ہمسائیگی کا ہے۔ دوست ممالک کا رویّہ بھی پوری طرح قابلِ بھروسہ نہیں۔ اِن حالات میں ملک کے اندر ایک طاقتور اور مضبوط حکومت کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ دشمن خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ، اپنے ناپاک اور جارحانہ عزائم میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک کمزور حکومت ایسے حالات میں نہیں پنپ سکتی۔ یہ صورتِ حال بھی صدارتی نظامِ حکومت کی متقاضی ہے جس کے تحت صدر کو ـــــ جو کہ ایک منتخب ادارہ ہوتا ہے ـــــ وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ کسی بھی معاملہ میں فوری، حتمی اور مناسب اقدام کر سکتا ہے۔ ایسے حالات میں پارلیمانی نظامِ حکومت کی کمزوری اور خصوصاً پاکستان ایسے پسماندہ ملک میں بالکل واضح ہے۔

حالات کے تقاضوں کا دوسرا پہلو ہماری اندرونی صورتِ حال ہے۔ ہم نے ملک میں پارلیمانی طرزِ حکومت کا تجربہ کیا، لیکن وہ بُری طرح ناکام ہوا۔ اب اس تجربہ کو دوہرانا تاآں وقت کہ حالات سازگار ہوں، قومی بقا کیلئے سمِّ قاتل ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم نے سخت زمین (پارلیمانی نظام) میں ہل چلانا (حکومت) چاہا۔ لیکن ہمارا ہل ٹوٹ گیا۔ اَب ہمیں کوئی اور موزوں زمین تلاش کرنا ہے۔ قوم کے سامنے واحد جمہوری متبادل صدارتی نظامِ حکومت تھا۔ سو حالات کے اِس طبعی تقاضا کو آئین میں پورا کر دیا گیا ہے۔

اندرونی حالات کے سلسلہ میں ایک اور بات سیاسی جماعتوں کا احیاء یا التواء ہے۔ پارلیمانی نظامِ حکومت میں سیاسی پارٹیوں کی حیثیت لازمہ کی ہے۔ صدارتی طرزِ حکومت میں بھی پارٹیوں کا وجود پایا جاتا ہے مثلاً امریکہ میں صدارتی نظامِ حکومت ہے، مگر وہاں دو مضبوط سیاسی پارٹیاں بھی ہیں یعنی ری پبلکن پارٹی اور ڈیموکریٹک پارٹی۔ اگر پاکستان میں حالات صدارتی نظامِ حکومت کا مطالبہ کر سکتے ہیں تو کیا سیاسی پارٹیوں کیلئے بھی گنجائش ہے؟ یہ ہے وہ سوال جس کا جواب ہم اِس جگہ دینا چاہتے ہیں۔

پاکستان ابھی ایک نوخیز ملک ہے۔ آبادی کی اکثریت اَن پڑھ، جاہل اور سیاسی شعور سے بے بہرہ ہے۔ اوسط درجے کے پاکستانی کی اقتصادی حالت اِتنی کمزور ہے کہ آزادانہ رائے کا اظہار اس سے ایک قربانی چاہتا ہے جس کیلئے اُس میں طاقت نہیں۔ اِن حالات میں سماج دشمن اور خود غرض عنصر کسی وقت بھی اس سیدھی سادھی اکثریت کو ہتھیا سکتا ہے۔ تخریبی عناصر کے حربوں کا صحیح اندازہ اور اُنکے اثرات کا صحیح مطالعہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک قوم میں بحیثیت مجموعی سیاسی شعور بدرجہ اتم پیدا نہ ہو جائے۔ اِس لئے فی الحال ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم اپنے ملک سے جہالت کو ختم کریں اور ذہنوں کے سیاسی جمود کو توڑ دیں۔ ہم نے سیاسی جمود کو توڑنے کا فقرہ اس لئے استعمال کیا ہے کہ محض تعلیم فائدہ نہ دے گی، بلکہ ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو ایک خاص نہج پر چلانا ہوگا۔ وہ تعلیم یافتہ نوجوان جو تعلیمی اداروں کے چھوٹے چھوٹے الیکشنوں میں بھی اپنی رائے کو "مقیّد" کئے ہوئے ہیں۔ ان سے بڑے الیکشنوں میں کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ پس تعلیم کے رواج کے ساتھ ساتھ ہمیں عوام کے سیاسی شعور کو بھی بیدار کرنا پڑے گا۔ اور جب تک قوم کے اندر حُبّ الوطنی اور خدمتِ ملک کا جذبہ سرائت نہیں کر جاتا۔ سیاسی جماعتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسے حالات میں

سیاسی جماعتوں کا احیاء قومی مفاد کی قربانی دے کر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی دانشمند ایسے اقدام کی حمایت کیلئے تیار نہیں ہو سکتا۔ پھر پاکستان کی بنیاد اسلامی نظریہ پر ہے۔ جب تک تمام مسلمان کہلانے والی آبادی اسلامی نظریہ کا ایک مشترک ڈھانچہ تیار نہ کرے، اُس وقت تک یہ خطرہ ہر وقت قائم رہے گا۔ کہ ایک خاص زاویۂ فکر رکھنے والا گروہ دوسرے مکاتیبِ فکر کے لئے وبالِ جان بن جائے، جن ملکوں کی بنیاد مذہب پر ہو، وہاں لوگوں کو رواداری اور قوتِ برداشت کی تعلیم دینا از حد ضروری ہے۔ ایک متعصب مذہبی جماعت کے برسرِ اقتدار آنے پر عین ممکن ہے ملک میں خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جائے۔ اِس لئے پاکستان ابھی سیاسی جماعتوں کے وجود کا متحمل نہیں بالخصوص جبکہ متعصب مذہبی جماعتیں سیاسیات کے میدان میں کود سکتی ہیں۔ پس سیاسی جماعتوں کا وجود نظریاتی طور پر اگرچہ کتنا ہی دلکش اور خوش نما نظر کیوں نہ آئے مخصوص حالات میں ان کا التواء ضروری ہوتا ہے۔ نئے آئین میں سیاسی جماعتوں پہ پابندی لگا کر اور صدارتی نظامِ حکومت کے تحت انفرادی بنیادوں پر انتخاب لڑنے کی وضاحت شامل کر کے ایک نہایت مستحسن قدم اُٹھایا گیا ہے اور وقت کے ایک اہم تقاضا کو پورا کیا گیا ہے، تاہم آئین میں ترمیم کی گنجائش رکھ کر اس بات کی ضمانت بھی دے دیگئی ہے کہ مناسب وقت آنے پر سیاسی جماعتیں بحال کر دی جائیں گی۔ جوں جوں ملکی معیشت سُدھرے گی اور تعلیم رواج پائے گی، حُبِّ وطنی، بے نفسی، وسعتِ نظر، آزادیٔ فکر اور خدمتِ قوم کے جذبات بھی اُبھرتے آئیں گے۔ یہ وہ فضا ہوگی، جہاں پارلیمانی حکومت بھی کامیابی سے چل سکے گی۔ اور صدارتی نظام کے تحت بھی سیاسی جماعتوں کا احیاء ہو سکے گا۔ بہر حال موجودہ حالات میں سیاسی جماعتوں کیلئے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ملک میں معاشی و سیاسی استحکام ان کے التوا کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور ان کا احیاء ملکی استحکام کے بغیر ناممکن نظر آتا ہے۔ ان حالات میں قوم کا اپنے فرض کو پہچاننا کوئی مشکل امر نہیں۔

پس جب ہم نئے آئین کو ایک "کارنامہ" کہتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہے کہ حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے یہ ایک جرأت مندانہ اقدام ہے۔ حکومت کی مشینری میں اہم تبدیلیوں کی ضرورت تھی لیکن ان کے لئے جرأت درکار تھی سو وہ جرأت اس آئین سے آشکار ہے۔ دوائی اگرچہ فی الحال کڑوی ہے۔ لیکن بیماری کی شدت کے لحاظ سے مجوّزہ علاج ناگزیر تھا۔ مُصفّی خون حاصل کرنے کے لئے "صافی" ایسی کڑوی دوائی کا استعمال کرنا ہی پڑتا ہے۔

آئین کی کامیابی کے سلسلہ میں ہمیں بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظمؒ کے "اتحاد، یقین اور تنظیم" والے فرمان کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر آج بھی قوم اس فرمان پر عمل پیرا ہو جائے، تو پاکستان قلیل عرصہ میں ترقی کی کئی منازل بسرعت طے کر سکتا ہے۔ اور یہ وقت ہے کہ قوم کو اتحاد، اعتماد اور تنظیم ایسی نعمتوں کی عظمت اور برکت سے آگاہ کیا جائے۔ پریس، ریڈیو اور تعلیم یافتہ طبقہ اگر اپنی ذمہ داری کو سمجھے، تو اِس موقعہ سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ ادارہ المنار نئے آئین کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہے۔

طلبہ کو ڈاکٹر سلام کا مشورہ:۔

پچھلے دنوں صدر پاکستان کے سائنسی مشیرِ اعلیٰ

اور ملک کے ممتاز سائنسدان محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے پشاور اور راولپنڈی میں قوم کے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے انہیں بعض زریں نصائح کیں۔ ایک موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: "اس وقت مادی اور سائنسی علوم کے میدان میں غیر مسلم اقوام چھائی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کے اپنے مضمون فزکس میں ۹۵ فی صد یہودی (غیر مسلم) ہیں۔ یہی حال دیگر مضامین کا ہے۔ اس لئے ہمارے نوجوانوں کو پورے انہماک اور محنت سے اپنے آپ کو اِس قابل بنانا چاہیئے کہ وہ اِس (علمی) میدان پر قابض ہو سکیں۔" ڈاکٹر صاحب موصوف کا آخری فقرہ جس میں ان کی اپنی ذات بھی کافی نمایاں ہے ہمارے طالب علم اور گورنمنٹ دونوں کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ "وہ ہمارے نوجوانوں کو پورے انہماک اور محنت سے اپنے آپ کو اِس قابل بنانا چاہیئے، کہ وہ اس (علمی) میدان پر قابض ہو سکیں۔" یہ نصیحت کوئی ناقابل عمل نصیحت نہیں۔ ان کی اپنی ذات اِس کی صداقت کی کافی دلیل ہے۔ ضرورت صرف اِس بات کی ہے کہ ہم اِس پر عمل کرنے کا عزم کر لیں۔ بس میدان ہمارے ہاتھ میں ہے۔

یہاں پر ہم گورنمنٹ کی توجہ اپنے ایک گذشتہ اداریہ کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں، جس میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ حکومت طالب علم کے لئے صرف یورپی سکولوں یا یونیورسٹیوں کا نصاب تجویز کرنے پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ انہیں یورپی طالب علم کی فضا بھی مہیا کرے۔ وہ فضا جس نے دنیا کے ۹۵ فیصد سے بھی زیادہ غیر مسلم محققین کو پیدا کیا۔ ہمیں ترقی یافتہ ممالک کی یونیورسٹیوں کے طریق کار کا جزوی نہیں بلکہ پورا پورا جائزہ لینا چاہیئے۔ اور بالخصوص یہ چیز دیکھی جائے کہ وہاں طالب علم کو کیا سہولتیں مہیا ہیں۔ اور اس پر بحیثیت طالب علم کے کیا پابندیاں عائد ہیں۔

جہاں تک سہولیات کا تعلق ہے پاکستانی طالب علم کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ اُسے معیاری مصنفین اور محققین کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ تو دیا جاتا ہے مگر اُسے وہ کتابیں مہیا نہیں کی جاتیں۔ وہ تھیوری کی کتابوں میں سائنس کے تجربات کا نظری مطالعہ تو کرتا ہے مگر انہیں عملی طور پر کرنے کے لئے وہ اکثر حالات میں سامان سے محروم رہتا ہے۔ اس لئے حکومت کو علمی کتابوں اور سائنسی سامان کی زیادہ سے زیادہ درآمد کرنی چاہیئے۔ اور ان کی درآمد پر سے ٹیکس اٹھا لینے چاہئیں۔ پھر پرائیویٹ تاجروں کی بلیک مارکٹنگ کو روکنے کے لئے حکومت کو اہم شہروں میں سرکاری بک سٹال کھولنے چاہئیں۔ اور صرف معمولی منافع پر ان کی فروخت کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عام تاجر بھی جائز منافع لے سکینگے اور ساتھ ہی غیر اخلاقی حربوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ طلبہ سستے اور مناسب داموں پر کتب خرید سکیں گے۔

دوسرا مسئلہ پابندیوں اور ڈسپلن کی سختی کا ہے۔ یہ بھی حکومت کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ ہماری رائے میں حکومت کو ایک کمیشن مقرر کرنا چاہیئے جو اس سلسلہ میں دُنیا کی مشہور اور ممتاز یونیورسٹیوں کے طریق کار کا مطالعہ کرے۔ اور جو فضا وہ اپنے طالب علم کے لئے مہیا کرتی ہیں اس کا جائزہ لے۔ پھر ہمارے ماحول کا اُن کے ماحول سے

مقابلہ کر کے ٹھوس سفارشات پیش کرے اور حکومت ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کا ذمہ لے۔

جب تک سہولیات اور پابندیوں کے یہ دونوں مسئلے حل نہیں کئے جاتے۔ اس وقت تک ہمارے طالب علم کے اندر نہ انہماک اور توجہ پیدا ہو سکتی ہے، اور نہ محنت اور تحقیق کا مادہ پرورش پا سکتا ہے۔ آج ہمارے ملک کو قابل سائنسدانوں، تجربہ کار انجینئروں، ماہر معیشت دانوں، بیدار مغز سماجی اور سیاسی مفکروں، اور تعمیری نقطہ نظر رکھنے والے اہل اور لائق ادیبوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگر ہماری حکومت ملک کی ہمہ گیر ترقی کیلئے اس تعین، امتزاج کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تو اُسے چاہیئے کہ وہ ہمارے لئے نہ صرف معیاری کتب اور تجرباتی سامان کا اہتمام کرے بلکہ ایک صحت مند فضا بھی مہیا کرے۔

امتحانات کی آمد آمد:

کالج سے متعلقہ بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات عنقریب ہونے والے ہیں۔ ہائر سیکنڈری امتحانات ۲۲ر مئی سے بی، اے فرسٹ ایئر کے

. . . . . امتحانات ۶ر جون سے، اور بی۔ اے سیکنڈ ایئر کے امتحانات ۲۶ر جون سے شروع ہو رہے ہیں۔ طلبہ امتحانات کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ اس موقعہ پہ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ طلبہ کو حضرت صاحبزادہ مرزا البشیر احمد صاحب کا وہ خطاب یاد دلادیں، جو آپ نے گذشتہ سال فضل عمر ہوسٹل کی سالانہ تقریب کے موقعہ پر فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ:-

"آپ لوگوں کا امتحان قریب ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ امتحان خوب توجہ اور محنت سے دیں۔ محنت اور توجہ کا معیار یہ نہ ہو کہ صرف پاس ہونا ہے۔ بلکہ یہ ہو کہ اعلیٰ نمبروں پہ پاس ہونا ہے۔ اور اس کے بغیر ترقی اور امتیاز محال ہے۔"

حضرت صاحبزادہ صاحب نے یہ بھی فرمایا:-

"دعا اپنے خالق سے ذاتی رابطہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جو شخص خدا تعالیٰ سے غافل ہے، وہ دراصل اپنی ہستی سے غافل ہے۔ محض اسلام اور احمدیت کا دعویٰ کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز عمل ہے۔"

پس طلبہ کو چاہیئے کہ وہ حضرت صاحبزادہ صاحب کے ارشادات کی روشنی میں امتحان کی تیاری اس نظریہ سے کریں کہ انہوں نے امتیاز حاصل کرنا ہے۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ دعا کی طرف بھی خصوصی توجہ دیں۔ کیونکہ یہ وہ حربہ ہے جو . . . . . ناممکنات کو ممکنات بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت امام جماعت احمدیہ فرماتے ہیں:-

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے
اے مرے فلسفیو! زورِ دعا دیکھو تو

عطاء المجیب راشد۔
بی۔اے (سالِ اوّل)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے دشمنوں سے حُسنِ سلوک

سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام جہانوں کے لئے کامل نمونہ بنا کر بھیجا تھا۔ ضروری تھا کہ آپ کی زندگی مختلف ادوار سے گذرتی تاکہ آپ نسلِ انسانی کے لئے انسانی حیات کے ہر شعبہ میں بطور مثال ہوتے۔ چنانچہ خدا کی خاص مصلحت کے تحت آپ پر یہ تمام حالات گزرے۔ آپ نے ہر موقعہ پر جن بلند اخلاق اور اولوالعزمی کا ثبوت دیا۔ وہ عدیم المثال ہے۔ آپ کی حیاتِ مبارکہ ہر پہلو سے ایک کامل نمونہ ہونے کی وجہ سے بنی نوعِ انسان کو دعوتِ عمل دیتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابھی بچہ ہی تھے لیکن آپ جب دُنیا کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے تو فسق و فجور اور ضلالت و گمراہی کو دیکھ کر آپ کا دل خون ہو جاتا۔ آپکی اوّلین خواہش تھی کہ دنیا صحیح راستہ پر گامزن ہو۔ لیکن اُن کے آستانہ پر سر جھکانے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ غارِ حرا وہ جائے عبادت تھی۔ جس میں یہ درِ یتیم تنہائی میں بنی نوعِ انسان کی اس پست حالت پر خُدا کے حضور روتا تھا۔ اور اُن کی اصلاح کا طالب ہوتا تھا ـــــ زمانہ گزرتا گیا۔ اور بالآخر اسی گداز دل رکھنے والے شخص کا انتخاب ہوا کہ اس کو صرف عرب کے لئے نہیں بلکہ تمام کائنات اور تمام زمانوں کے لئے ہادی اور نبی بنا کر بھیجا جاتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دعویٰ نبوت سے پیشتر اپنی قوم میں عزت و توقیر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کے اعلیٰ اخلاق اور عمدہ عادات آپ کی بلند شخصیت کی آئینہ دار تھیں۔ انہی عمدہ خصائل کی وجہ سے آپ نے اُن کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ اس وقت بھی بسا اوقات آپ عربوں کو بعض غلط رسوم سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس بات کے باوجود وہ تمام آپ کے اخلاق سے متاثر ہو کر آپ کو امین اور صدیق کے القاب سے پکارا کرتے۔

اگر ہم دعویٰ نبوت سے قبل کی زندگی کا ایک سرسری جائزہ لیں اور پھر نبوت کے دعویٰ کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا مشاہدہ کریں تو جہاں پر اور کئی انقلابات آئے وہاں پر آپ سے آپ کی قوم کے سلوک کا یکسر بدل جانا بھی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ جب آپ نے پہلی مرتبہ کوہ صفا پر لوگوں کو اکٹھا کیا۔ اور تین سال کی خاموش تبلیغ کے بعد پہلی مرتبہ وحدانیت کا نظریہ پیش کیا۔ اور یہ اعلان کیا۔ کہ مجھے خدا نے نبوت عطا کی ہے۔ تو اس اعلان کو سنتے ہی قبائل عرب کے سلوک میں ایک عظیم انقلاب رُونما ہو گیا۔ وہ لوگ جو کسی وقت آپ کی عقل و دانش کے معترف تھے، آپ کو پاگل اور دیوانہ قرار دینے لگے۔ آپ کے عدل و انصاف کے مدّاح آپ کو کذّاب اور مفتری جاننے لگے۔

غرض اس اعلان کے بعد قبائلِ عرب کی طرف سے آپ کی مخالفت شروع ہوئی۔ اور مخالفت کے اس سیلاب کا آغاز ہوا جس کا ہمارے آقا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں کامل استقلال اور صبر سے مقابلہ کیا۔ شروع میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ ایک معمولی تحریک ہے جو خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اور اس وجہ سے لوگوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ادھر دوسری طرف نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خالقِ حقیقی کے فرمان کے تحت ہر ممکن موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تبلیغ کرتے رہے۔ اور آپ کی طرف سے پیش کی جانیوالی سچائی سنجیدہ اور باشعور لوگوں پر آہستہ آہستہ اثر کرنے لگی۔ اس وجہ سے آپ کی یہ آواز قرب و جوار میں پھیل گئی۔

جب قریشِ مکہ نے دیکھا کہ آپ کی یہ تحریک چند دنوں کی بات نہیں۔ بلکہ رفتہ رفتہ مضبوط ہوتی جارہی ہے۔ تو انہوں نے آپ کی زیادہ مخالفت کرنی شروع کر دی۔ شروع شروع میں یہ لوگ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس نئے دین کو ختم کر دیں جو اُن کے بقول اُن کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ اُن کو آپؐ کی ذات سے کوئی عناد نہ تھا بلکہ کبھی کبھی اوقات وہ یہ افسوس کرتے تھے کہ ایک اچھا نوجوان (نعوذ باللہ) گمراہ ہو گیا ہے۔ وہ دینِ اسلام کو ختم کرنے۔ کے لئے ہر ممکن تدبیر کرتے رہے۔ مسلمان ہونیوالوں پر مظالم بھی ڈھاتے رہے۔ لیکن جب کوئی حیلہ کارگر ثابت نہ ہوا تو انہوں نے سوچا کہ اس تحریک کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہم اس کے بانی کو ختم کر دیں تو اُس کی جاری کردہ یہ تحریک خود بخود ختم ہو جائے گی۔

چنانچہ اب اُن کو آپؐ سے بھی دشمنی پیدا ہو گئی۔ ایک طرف وہ آپ کے دین کے دشمن تھے اور دوسری طرف وہ آپؐ کی زندگی ختم کرنے کے درپے تھے۔ غرض بانیٔ اسلام پر مخالفت اور مصائب کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔

اگر ہم کفار کی اس مخالفت اور اس کے مقابل پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلوک کا جائزہ لیں تو اس ایک بات سے ہی کافی حد تک آپ کے اعلیٰ اخلاق کی رفعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص کی ہمیشہ سے مخالفت کی جاتی رہی ہو، اور وہ اِن ہی حالات میں پروان چڑھا ہو۔ تو وہ اس بات کو کوئی انوکھی بات خیال نہیں کرتا لیکن نبیٔ پاک صلعم کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ ایک وقت میں قریش آپ کے مدّاح تھے جو بعد میں آپ کے دشمن بن گئے۔ انہوں نے آپ کے دین کی مخالفت شروع کر دی اور مخالفت بھی اس قسم کی کہ اُس کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔ لیکن ہمارے آقا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولوالعزمی کا یہ کمال ہے کہ آپ نے نہ صرف ان مظالم کو برداشت کیا۔ اور ان نامساعد حالات کا مقابلہ کیا بلکہ جب بھی ان دشمنوں سے انتقام لینے کا موقع آیا، آپؐ نے عفو اور درگذر سے کام لیا۔

روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک انسان اپنے عزیزوں اور دوستوں سے تو حسنِ سلوک کرتا ہے لیکن جب کسی دشمن سے واسطہ پڑتا ہے تو اُس سے نرمی اور شفقت کا سلوک نہیں کرتا۔ ہر صاحبِ اختیار اُس کو قرار واقعی سزا دیکر چین لیتا ہے۔ اگر کوئی انسان اس سے اعلیٰ اخلاق کا مالک ہو تو اُس سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے دشمن سے

بدسلوک نہ کرے گا۔ لیکن ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو تمام جہانوں کیلئے باعثِ رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اس معیار سے بہت بلند، حسن و احسان کے افقِ اعلیٰ پر بے مثال مقام رکھتے تھے۔ آپ نہ صرف اپنے دشمن سے بدسلوکی نہ کرتے تھے، بلکہ جب بھی کسی دشمن سے بدلہ لینے کا موقع آتا۔ آپ کمال درجہ کی نرمی دکھاتے۔ عفو و درگذر سے کام لیتے ہوئے اُسے چھوڑ دیتے اور اُس کے حق میں دُعائے خیر فرماتے۔ آپ کا یہ سلوک کسی معمولی رنجش والوں اور معمولی تکلیف دینے والوں سے نہ ہوتا تھا۔ بلکہ آپ کا یہ مشفقانہ برتاؤ اُن لوگوں سے ہوتا تھا، جو ہر وقت اپنے تمام سامانوں کے ساتھ آپ کو تکلیف دینے پر تلے رہتے تھے۔ ہر دم آپ کے خلاف منصوبہ تراشیوں میں مصروف رہتے تھے، اور جب بھی کوئی تکلیف دینے کا موقع آتا۔ ہرممکن تکلیف دہی سے نہ چوکتے۔ صرف نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی اُن کے مظالم کا نشانہ نہ بنتے تھے بلکہ جو شخص بھی آپ کی آواز پر لبیک کہتا تھا۔ یا آپ کی باتوں کی تائید کرتا تھا۔ قریش کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بن جاتا۔

لکھنے کو لکھ دیا جاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ پر ظلم ہوتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اُن مظالم کا صحیح صورت میں اندازہ کرنے سے قاصر ہیں جو اُن پر کئے جاتے تھے۔ قریشِ مکہ کے لئے مسلمانوں کو تپتی ہوئی ریت پر لٹانا۔ اُن کی چھاتیوں پہ پہروں جھلس دینے والے پتھر رکھنا تو معمولی بات تھی۔ مظلوم مسلمانوں کے پاؤں میں رسیاں باندھ کر انہیں مکہ کی گلیوں اور پتھروں پر گھسیٹا جاتا۔ بعض صحابہؓ کے متعلق آتا ہے کہ اُن کا شقی القلب آقا اُن کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لیٹا دیتا۔ اُن کا جسم جلنا شروع ہو جاتا۔ پھر انکو اس حالت میں گھنٹوں تک رکھا جاتا کہ اُن کے جسم کی چربی پگھل کر اُن کو ملوں کو ٹھنڈا کر دیتی۔ کسی مظلوم صحابہ کو دھوئیں کا عذاب دیا جاتا۔ ان کے جسموں کو شوئیوں سے چھیدا جاتا۔ اور جب یہ تمام باتیں غیر متزلزل یقین سے لبریز جانثار صحابہ کی اس آواز میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکتیں کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ تو یہ بدبخت لوگ، اُن فاقہ کش مومنوں سے تعلقات منقطع کر لیتے۔ اُن کے نان و نفقہ کے بند کرنے کی کوشش کرتے لیکن اُن کے پایۂ ثبات میں کوئی لرزش نہ آتی۔

خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ جب آپ بازار سے گزرتے، تو اُن پر آوازے کسے جاتے، تکلیف دہ کلمات سے پکارا جاتا۔ بسا اوقات آپ پر گندگی اور غلاظت پھینکی جاتی۔ ایک دفعہ آپ نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ پر اُونٹ کی اوجری لاکر رکھ دی گئی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کو قتل کرنے کی بارہا کوشش کی گئی۔ لیکن کفار کے اِس ناپاک ارادہ کی تکمیل کی راہ میں وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ کا آسمانی نوشتہ ہر مرتبہ روک بن جاتا رہا۔

سراقہ بن مالک کے تعاقب کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت صدیق اکبرؓ کی معیت میں مکہ سے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے تو راستہ میں غارِ ثور میں ۳ دن قیام کرنے کے بعد جب آپ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو ایک بدوی رئیس

سراقہ بن مالک آپؐ کے قتل کی نیت سے آپؐ کے پیچھے نکلا۔ قریش مکہ نے آپؐ کے قاتل کے لئے سو اونٹ کا انعام خطیر مقرر کیا ہوا تھا۔ جب وہ آپؐ کی طرف بڑھنے لگا۔ تو اسی کوشش میں دو تین مرتبہ اپنے گھوڑے سے گر گیا۔ اس پر اُس نے اِس قصد بد کو تبدیل کیا اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اُس شخص کو جو آپ کو قتل کرنے یا پکڑنے کے ارادہ سے آیا تھا۔ نہ صرف کچھ نہ کہا بلکہ اُس کی خواہش پر ایک امن کی چٹھی لکھ دی۔ کیا یہ امر آپؐ کی رحمدلی پر شاہد ناطق نہیں کہ ایک شخص ایک قوم کے سردار کو قتل کرنے کے لئے جاتا ہے اور پکڑے جانے پر اُس کو مستقل امن کا پروانہ لیکر لوٹتا ہے؟

ایک مرتبہ ایک خدائی نشان کے ماتحت قریش مکہ ایک سخت قحط میں مبتلا ہو گئے۔ قحط کی وجہ سے غرباء کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ ان حالات میں قریش مکہ بے چارہ ہو کر حضورؐ کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ اس بلا سے نجات پانے کے لئے دعا فرمائیں۔ اگرچہ یہ قحط آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا ایک نشان تھا۔ لیکن آپؐ سے مخلوق خدا کی یہ حالت نہ دیکھی جاتی تھی۔ فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اور قحط دور ہو گیا — اللہ! اللہ! کیا ہی مشفق آقا ہے کہ خود تو اپنے ہاتھ سے اپنے جانی دشمنوں تک کو کچھ نہیں کہتا۔ لیکن جب خدا کی طرف سے اُن پر ایک عذاب آتا ہے تو اُس کے دور ہونے کیلئے دعائیں کرتا ہے۔

اپنا دین کسے پیارا نہیں ہوتا؟ — ہر شخص اپنے عقیدہ سے بے پناہ محبت رکھتا ہے۔ اور اُسکی بے حرمتی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن صرف آپؐ کی ذات کے دشمن نہ تھے، بلکہ اُن کی حقیقی دشمنی تو آپؐ کے دین سے تھی۔ دین اسلام کی ترقی اور مقبولیت اُن کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ہر وقت اِس نئے دین کو جسے وہ سراسر غلط خیال کرتے تھے مٹانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ کفار مکہ اُن کی باتوں کو سننے کیلئے تیار نہیں تو آپؐ طائف کی بستی کے لوگوں کو پیغام حق سنانے کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ لوگ تو کفار مکہ سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اُن لوگوں نے آپؐ کی باتیں سننے سے انکار کر دیا۔ اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ شہر کے کتوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ شہر کے اوباش لوگ آپؐ پر پتھراؤ کرتے تھے۔ اُن ظالموں نے اِس قدر پتھر برسائے کہ آپؐ کے ٹخنوں سے خون بہنے لگا۔ آپؐ کا منہ بھی خون سے لت پت ہو گیا — اسی دردناک حالت میں خدا کا ایک فرشتہ حاضر ہوا۔ عرض کی کہ اگر اجازت ہو تو میں ان دونوں پہاڑوں کو اِس بستی پر گرا کر ان لوگوں کو پیس ڈالوں۔ لیکن آپؐ نے اجازت نہ دی۔ اور فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ کہ اے خدا! تو ہی ان لوگوں کو ہدایت دے۔ کیوں کہ یہ نہیں جانتے کہ یہ سلوک کس سے کر رہے ہیں — اپنے اس قدر ظالم مذہبی دشمنوں کے حق میں اس تکلیف کی حالت میں بھی دعائے خیر کہنا، دشمنوں سے حسن سلوک

کا نادر شاہکار ہے۔

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِس بے پایاں عفو و درگزر کو دیکھ کر بسا اوقات حقائق سے بے خبر مخالفین کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپؐ کا یہ درگزر محض اِس وجہ سے تھا کہ آپؐ کے پاس بدلہ لینے کی قوّت موجود نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ حقیقت اِسکے برعکس ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک وقت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طاقت دفاعی لحاظ سے بہت کمزور تھی۔ آپ کے پاس مادی طاقت و قوّت کا فقدان تھا۔ اگرچہ اُس وقت بھی آپؐ کے پاس خدائے قادر کی رُوحانی مدد کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار موجود تھا۔ لیکن اگر مادی لحاظ سے ہی دیکھا جائے تو کچھ عرصہ کے بعد آپؐ پر وہ وقت بھی آگیا جب عرب کا تمام مال و دولت آپؐ کے قدموں میں لاکر ڈال دیا گیا۔ فتح مکّہ کو آپؐ کے مادی اقتدار کی ایک زندہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

کئی برس تک کفارِ مکّہ کے مظالم برداشت کرنے کے بعد جب فتح و نصرت نے آپؐ کے قدم چُومے اور آپؐ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ ایک کامیاب حکمران کی حیثیت سے مکّہ میں داخل ہوئے تو مکّہ کے یہ تمام ظالم کفّار آپ کے سامنے ماتحتوں کی صُورت میں لائے گئے۔ اِن کفّار کی گردنیں اپنے ناجائز جور و جفا روا رکھنے پہ شرم کے مارے جھکی ہوئی تھیں۔ کیونکہ اِن میں وہ بدبخت بھی شامل تھے جو آپؐ اور آپؐ کے جاں نثاروں پہ مظالم ڈھایا کرتے تھے۔ شرافت کو بالائے طاق رکھتے ہُوئے مُسلمانوں سے انسانیت سوز سلوک کیا کرتے تھے۔ صحابہؓ کو ابھی تک وُہ مظالم نہیں بھُولے تھے۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ اُن سے بدلہ لیا جائے۔ اور ادھر کفّار کو بھی یہی خیال تھا کہ آج اُن سے ہر ممکن ذلیل کن سلوک کیا جائے گا۔ لیکن نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ــــ جو اپنے دِل میں اپنی قوم کے لئے ایک گداز دِل رکھتے تھے ــــ جو انتہائی مظالم برداشت کرنے کے باوجود دشمنوں کے حق میں بددُعا کرنے کے روادار نہ تھے ــــ اُن تمام لوگوں کو لا تثریب علیکم الیوم کہہ کر آزاد کر دیا ــــ آج دُنیا کی اقوام اپنی جمہوریت نوازی اور حسنِ اخلاق پہ نازاں ہیں۔ لیکن دُنیا میں کونسی قوم ہے جو اِس جیسی کوئی ایک آدھ ہی زندہ جاوید مثال پیش کر سکے کہ کسی شخص نے اپنے جانی دشمنوں اور خُون کے پیاسوں کو اقتدار حاصل کر لینے کے بعد مطلقاً کچھ نہ کہا ہو۔ اور مستزاد یہ کہ اُن محکوموں کو آزاد بھی کر دیا ہو۔

اِس مثال کے پیشِ نظر یہ کہنا بالکل بے بنیاد ہے کہ آپؐ کا عفو کسی مجبوری کی بناء پر تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے اختیار و اقتدار کی حالت میں دشمنوں کو معاف کر دیا۔ کیونکہ حقیقی معنوں میں درگزر اسی حالت میں ہو سکتا ہے۔

الغرض آپ کی حیاتِ مبارکہ کا یہ ایک پہلو بھی اسقدر وسیع ہے کہ اس کا احاطۂ تحریر میں لانا ناممکن ہے۔ انسانیت کے اِس محسنِ اعظم کے احسانات کو دیکھ کر بے اختیار مُنہ سے نکل جاتا ہے

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

درازیٔ عمر کے متعلق دانایانِ فرنگ کے جدید نظریات

امریکن سائنسدانوں کی تحقیق کا نچوڑ

درازیٔ عمر کا مسئلہ ہر زمانے کا ایک دلچسپ موضوع رہا ہے۔ کیونکہ ہر متنفس کی یہ فطرتی خواہش ہے کہ وہ اِس دُنیائے رنگ و بُو میں بہترین صحت کے ساتھ طویل عرصہ تک زندہ رہے۔ تاوہ قدرت کی ان رنگینیوں سے حظ اندوز ہو سکے جو صفحۂ ہستی پر بکھری پڑی ہیں۔ ان لطافتوں کو سمیٹ سکے جو اُس کی رُوح کی غذا ہیں۔ اور اُن بلند عزائم کو عملی جامہ پہنا سکے جو اُسکی زندگی کا منتہیٰ ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ قوانینِ صحت پر پُوری طرح عمل پیرا ہونے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

مشرق تو ابھی تک اپنی کوتاہ ہمتی کے باعث ان نظریات کو سمجھنے سے ہی قاصر ہے جن پر کاربند رہنے سے انسان اعلیٰ ترین صحت کے حصول کے ساتھ دامنِ مُراد کو بھر سکتا اور خوشیوں سے معمور زندگی بسر کر سکتا ہے۔ بلکہ وہ تو تقدیر کے چکّر میں اِس بُری طرح پھنسا ہے کہ درازیٔ عمر کی فلاسفی اُس کے حیطۂ ادراک سے ہی بالاتر ہے۔ کسی کی حیاتِ مستعار کو یہی غم روز بروز کم کئے جا رہا ہے کہ زندگی کے دن تو بس مقرر ہیں۔ ان کے کم و بیش ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی کہتا ہے کہ پیدائش کے دن سے ہی جب ہماری عمر کے مقررہ ایّام ہمارے ماتھے پر لکھ دیئے گئے ہیں، تو پھر قوانینِ صحت کے مطابق عملی مشقتوں میں ڈالنے سے کیا حاصل۔ کسی کا یہ خیال ہے کہ یہ سب ناقابلِ عمل اصول ہیں۔ اگر کچھ عملی سہولتیں میسّر ہیں بھی تو صرف مغربی اقوام کے لئے۔ ہم اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔ غرضیکہ مختلف اقوال سے ہماری بے چارگی اور بے بسی کا اظہار ہوتا ہے۔

ہر چند کہ مغربی دنیا بھی اپنی تمامتر ترقیات کے باوجود عمرِ نوح تو حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن اس میں بھی ذرہ بھر شک کی گنجائش نہیں کہ وہ لوگ اپنی مسلسل تگ و دو کے باعث، اور پیہم تجربات کے ساتھ اِس چشمۂ حیوان کے قریب ضرور پہنچ چکے ہیں جن سے درازیٔ عمر کے سوتے پھُوٹتے ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ مستقبلِ قریب میں وہ ہر شخص کو کم از کم "طبعی عمر" کی مسرتوں سے ہمکنار کر سکیں، جیسا کہ متعدد لوگ ان فطرتی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ایک سو سال بلکہ اِس

سے زائد زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔
لیکن اِس میں کس کو کلام ہے کہ اچھی صحت اور خصوصاً شباب کا زمانہ انسانی زندگی کی رونق اور اسکی تمامتر دلچسپیوں کا واحد مرکز ہے۔ جسکی موجودگی میں اسکو کائنات پتہ پتہ حسین نظر آنے لگتا ہو۔ صحت مند جوانی کی یہ شعر کتنی اچھی ترجمانی کرتا ہے ؎

مئے رنگین تھا تازہ پانی بھی
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا اسمِ اعظم ہے جس کے ورد سے وہ فائز المرام ہستیاں درازیٔ عمر اور حیرت انگیز صحت کے حصول کے لاینحل مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ تاہم بھی اُن کو آویزہ گوش بناکر انہیں پوری طرح کاربند ہوں اور ان گریز پا ساعتوں کے پاؤں میں زنجیر ڈال سکیں۔ جو لمحہ بہ لمحہ ہماری عمر کے خوشگوار لمحات کو کم کرنے میں کوشاں ہیں۔

حجاج ثقفی جو اپنے زمانے کا ایک مشہور ظالم حکمران ہو گذرا ہے۔ اِس کے دورِ حکومت میں تیاذوق ایک فاضل طبیب تھا۔ اُس نے امراض سے محفوظ رہنے اور درازیٔ عمر کو حاصل کرنے کے چند اصول مرتب کئے تھے جو یقیناً آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔
تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اُس زمانہ کے حکمران نے ان وقیع طبی جواہر پاروں کو سنہری حروف سے لکھوا کر آویزاں کیا ہوا تھا۔

۱۔ جب تک معدہ میں پہلا کھانا موجود ہو، اُس وقت تک دوسرا کھانا کھانے پرہیز کرو۔
۲۔ جس چیز کو تمہارے دانت اچھی طرح چبانے سے قاصر رہیں، اُس کو مت کھاؤ۔ کیونکہ اُس کو تمہارا معدہ ہضم نہیں کرسکے گا۔
۳۔ ہمیشہ کھانا کھانے کے دو گھنٹہ بعد پانی پینے کی عادت ڈالو، کھانے کے ساتھ پانی پینا معدہ کو کمزور کرکے بدہضمی پیدا کرتا ہے، جو تمام امراض کی جڑھ ہے۔
۴۔ دوسرے روز غسل کرو۔ اس سے جسم کے تمام وہ فضلات خارج ہوتے ہیں، جن تک ادویہ کی رسائی نہیں ہوتی۔
۵۔ خون میں افزائش پیدا کرنے کے طریقوں اور تدابیر کو ہمیشہ مدِنظر رکھو۔
۶۔ ہر فصل میں ایک بار قے کرو، اور ایک بار مسہل لو۔
۷۔ پیشاب کی حالت میں بھی مت رہو۔ خواہ تم سوار ہی کیوں نہ ہو۔
۸۔ سونے سے قبل رفع حاجت کو اپنا معمول بناؤ۔

ان ہدایات کے مطالعہ سے اصولی طور پر جو چیز ہمارے ذہن کی گہرائیوں میں ایک نہ ٹلنے والا اثر

چھوڑ جاتی ہے، وُہ "اعتدال" ہے۔ یعنی اکل و شرب میں اعتدال، جذبات میں اعتدال، ورزش میں اعتدال، خواب و بیداری میں اعتدال، اور دماغی و ذہنی قویٰ کے استعمال میں اعتدال ہے۔

قوانینِ صحت اور ہائیجن کے اُصول ہمیں کسی چیز سے نہیں روکتے۔ صرف ہر چیز کے استعمال میں حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہونے کی تلقین کرتے اور ان راستوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن پر چل کر ہم صحت کو عمدہ بنا سکیں۔

ولایت کے مشہور تاریخی قبرستان ویسٹ منسٹر ایبے میں تھامس پار نام کے ایک شخص کی قبر ہے جو ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا، اور ۱۵۲ سال کی عمر پاکر ۱۶۳۵ء میں فوت ہوا۔ اُس کے متعلق یہ ذکر ہے کہ جب وُہ ۱۳۰ سال کا تھا، تو اپنے کھیت میں کام کیا کرتا تھا، اور فُرصت نکال کر اُجرت پر دُوسروں کا کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اُس نے دُوسری شادی کی۔

اس کو اتنی طویل اور عمدہ صحت میں دیکھ کر موت سے چند ماہ قبل بطور عجوبہ اور حیرت انگیز چیز کے چارلس اوّل کے سامنے پیش کیا گیا۔ چارلس نے اُس کو شاہی مہمان رکھا۔ اور شاہی دسترخوان کے نوادرات اور لذیذ کھانے مثلاً گوشت۔ ہر قسم کی مٹھائیاں۔ اعلیٰ ترین شرابیں اُس کو کھلائے جانے لگے۔ اور عیش و عشرت کے تمام سامان اُس کے لئے مہیا کئے گئے جو ایک شاہی مہمان کے شایانِ شان ہو سکتے تھے۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ شاید وُہ اِن غذائی تبدیلیوں سے زیادہ قوی، زیادہ تنومند اور قوی الجثہ ہو گیا ہو گا، ہرگز نہیں۔ بلکہ اِس غذائی تبدیلی نے اُس کی زندگی کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ اور وُہ اس کے تھوڑے عرصہ بعد داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

دورانِ خون کا مشہور محقق ڈاکٹر ولیم ہاروے کہتا ہے کہ کیمیاوی امتحان پر اُس کے تمام قویٰ اسکی بہترین صحت کے آئینہ دار تھے۔ اگر اُس کی غذا اور آب و ہوا میں یہ تبدیلی نہ کی جاتی، اور تعیشات کو اُسکی زندگی میں داخل نہ ہونے دیا جاتا، تو اُس میں کافی عرصہ جینے کی سکت تھی۔

مزید تحقیقات نے اِس چیز کو بھی بے نقاب کر دیا ہے کہ وُہ کیا کھاتا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

اُس کی اصلی غذا سادہ روٹی، تازہ دُودھ، دُودھ کے دیگر مرکبات، تازہ سبزیاں، تازہ میوے، کافی مقدار میں پانی اور کسی قدر مچھلی تھی اور انہی پر اُسکی درازیٔ عُمر کا راز مخفی تھا۔

پہلی گول میز کانفرنس کے پریذیڈنٹ اور سلطنتِ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر رامزے میکڈانلڈ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاندھی جی نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ:۔

"دُوسری چیز جس سے ہم متعارف ہوئے وُہ آپ کی حیرت انگیز محنتی زندگی ہے۔ آپ سکاٹ لینڈ کی خوشگوار اور زندگی بخش فضا میں پلے اور پروان چڑھے۔ لیکن آپ کی سیمابی فطرت نے نہ تو خود راحت و آرام کو کبھی پسند کیا اور نہ ہم لوگوں کو اس عادت کا شکار ہونے دیا۔"

وہ بڑھاپے میں بھی نہایت زندہ دل اور جوان فکر انسان تھے۔ سکاٹ لینڈ جیسے ٹھنڈے ملک میں غریب ماہی گیروں کی سوسائٹی میں پرورش پانے کے باعث میکڈانلڈ کا جسم عنفوانِ شباب سے ہی کافی مضبوط اور جفاکشی کا عادی تھا۔

آپ کافی تیز قدموں کے ساتھ دس دس میل تک ٹہلتے۔ اور تعجب یہ کہ اس کے باوجود جب آپ لمبی دوڑ لگا کر واپس آتے تو آپ کے چہرہ پر تھکاوٹ کے آثار تک دکھائی نہ دیتے تھے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ تکان کے نام تک سے واقف نہیں۔

آپ سادہ خوراک استعمال کرتے، گیہوں کے بے چھنے آٹے کے بسکٹ استعمال کرتے اور شراب سے مکمل پرہیز برتتے تھے۔

ٹرکی کے "زارو آغا" نے ۱۶۱ سال کی عمر پائی۔ اس کی پیدائش ۱۷۷۴ء میں ہوئی تھی۔ یہ چھ فٹ سے زائد مضبوط جسم کے ایک دراز قد جوان تھے۔ ۱۵۶ برس تک ان کے جسم میں اتنا دم تھا کہ سیدھا تن کر چل سکتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں تمام دُنیا کے سفر کا انہیں شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ یہ امریکہ میں کچھ روز رہ کر انگلینڈ چلے گئے۔ ان ممالک کے مشہور ڈاکٹروں نے ان کی صحت کا معائنہ کر کے تعجب کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنی عمر میں گیارہ شادیاں کیں۔ چنانچہ گیارھویں بیوی اُن کے بستر مرگ پر موجود تھی۔ ان میں سے ۳۶ بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے اکثر نے سو سال سے زائد عمر پائی۔

ٹرکی کے باشندے اُسے تفنّنِ طبع کے طور پر ۱۳۰ سالہ بڈھا کہنے لگے جس سے اُسے قلبی تکلیف ہوئی اور اسی غم میں وہ بیمار پڑ گئے۔ قسطنطنیہ کا باشندہ ہونے کے باوجود اُس نے زندگی بھر کبھی گوشت نہیں کھایا۔

اپنی طویل عمر کے آخری لمحات میں اُس نے اپنی درازیٔ عمر کے رموز بتاتے ہوئے کہا کہ:-

"درازیٔ عمر کے لئے میں کوئی نسخہ نہیں جانتا لیکن اِس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، کہ تمام عمر محنت کش کسان اور ہر کام میں حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہونے کے باعث ہی میں اتنی لمبی عمر تک جی سکا ہوں۔ ہرے بھرے میدان کی کھلی ہوا میں میرا زیادہ وقت گذرتا تھا۔ شراب، تمباکو اور تمام منشی اشیاء سے مجھے طبعاً نفرت تھی۔ تازہ دُودھ میں خوب پیتا تھا۔ پھل اور سبزیاں میری مرغوب خاطر خوراک تھیں۔ دن رات میں میں صرف دو بار خوراک استعمال کرتا تھا۔ خوراک کی مقدار یکساں رہی۔ اس میں کمی بیشی نہیں ہونے پائی۔

ٹرکی میں اس وقت بھی ۵۰۰ سے زائد ایسے آدمی ہیں جن کی عمریں ۱۲۵ برس سے متجاوز ہیں۔ میں سب سے زیادہ بوڑھا ہوں۔ اِس لئے ترکستان کی گورنمنٹ نے مجھے تمام دُنیا کا سفر کرنے کا پورا خرچ دیا ہے۔ جب میں نیویارک میں تھا۔ تب ہر روز بلاناغہ ۲ دو میل ضرور ٹہلتا تھا۔ چہل قدمی کی عادت میں نے کبھی ترک نہیں کی۔ زندگی بھر

میں کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوا۔"

دُنیا کے سب سے لمبی عُمر پانے والے کے چار اُصول

ملک چین کا ایک معمر ترین انسان "لی چنگ جون" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۱۵۰ برس میں یہ چینی بڈھا اپنے کاروبار سے ریٹائر ہو کر اپنے گاؤں آیا۔ اور ۸۰ برس تک دیسی جڑی بوٹیوں کی تجارت میں مشغول رہا۔ اپنی عُمر میں اُس نے ۲۴ شادیاں کیں جن میں سے ۱۸۰ بچے پیدا ہوئے۔ دواؤں کے مسلسل بیوپار نے "لی چنگ جون" کو "حکیم حاذق" بنا دیا۔

کیا یہ تعجب انگیز امر نہیں کہ ۲۰۰ برس تک اُس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ اُس کے گالوں کی سُرخی، آنکھوں کی چمک، دانتوں کی مضبوطی، قوتِ ہضم کی عمدگی اور کوسوں پیدل چل سکنا۔ یہ تمام اُمور اِس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ وہ اِس دُنیائے رنگ و بُو میں غیر معمولی جسمانی قویٰ لیکر آیا ہے۔

اُس نے اِس شاندار صحت اور طویل العمر ہونے کے چار اُصول بیان کئے ہیں جو بیحد دلچسپ ہیں۔

۱۔ دِل کو ہمیشہ خوش رکھو۔ ذہنی افکار، غم و غصہ حسد اور چڑچڑاپن وغیرہ جسم میں بعض خطرناک زہریلے مواد پیدا کر دیتے ہیں جن سے شدید تاثر کے باعث جسم مسلسل کمزور اور نحیف ہو جاتا ہے اور بالآخر اُسے موت کے گھاٹ اُتار کر ہی دم لیتا ہے۔

۲۔ کچھوے کی طرح بیٹھو۔ یعنی دن کے کسی لمحہ میں اپنے تمام تر اعضاء و جوارح اور دماغی و فکری قوتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے تنہائی کا ایک وقفہ مقرر کرو۔ یہ امر انسان کے حُسن و قبح کے سوچنے کا موقعہ دیتا، زندگی کی اس طویل مسافت میں ترقی کی منزل پر گامزن ہونے کے لئے اُبھارتا اور بلند پروازی کی تحریص دلاتا ہے۔ جن کے تصوّر سے ہی انسانی رُوح غیر فانی بالیدگی سے ہمکنار ہو کر جھومنے لگتی ہے۔

۳۔ کبوتر کی چھاتی بڑھا کر پڑھو۔ یعنی اپنے دِل اور پھیپھڑوں سے پُوری طرح کام لے کر بار بار گہرے سانسوں کے ذریعہ آکسیجن کو زیادہ سے زیادہ جذب کرنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیئے، اِس سے پُوری طرح دورانِ خُون ہو کر تمام اعضاء کی پرورش ہوتی ہے۔ نیز خُون صاف ہو کر مختلف امراض سے محفوظ رہنے کی قوّت پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ کُتّے کی طرح سونے کی عادت ڈالو۔

یہ ایک قدیم زمانے کی کہاوت چلی آتی ہے، جس سے مُراد گہری نیند سونا ہے۔ جو کہ انسانی صحت کی ایک عُمدہ علامت ہے۔

کیونکہ پُرسکون نیند حاصل کرنے کے لئے کافی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ نعمت بیکار اور نکمّے انسان کو نصیب نہیں ہو سکتی۔

آپ نے اکثر اِس امر کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ کہ بغیر کسی پروگرام کے بیکار رہنے والے امراء رات بھر کروٹیں بدلتے پریشانی میں گذار دیتے ہیں۔

اچھی صحت کے حصول کے لئے یہ ضروری ہے، کہ انسان دِن بھر خُوب کام کرے اور رات کو میٹھی نیند کی لذّت اُٹھائے۔

قریشی اعجاز الحق
سیکنڈ ایئر بی۔ اے (آنرز)

حسانؓ کی شاعری

زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کی شاعری بدویانہ اخلاق و عادات کی آئینہ دار تھی۔ اس میں شجاعت و فصاحت غیرت و حمیت اور قومی تفاخر کو ندرتِ الفاظ کے سامان سے مزین کیا جاتا تھا۔ مگر طلوعِ اسلام کے بعد اُن کی ذہنی، سیاسی اور مذہبی زندگی میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا جس نے ان کو بہت متاثر کیا۔ چونکہ شاعر اپنے ماحول کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے عہد کے جذبات کو مؤثر رنگ میں بیان کرتا ہے۔ نیز وہ اپنے تأثرات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس لئے عہدِ نبوت کی شاعری جاہلیت اور اسلام دونوں کی زندگی کا مجموعہ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے شعراء کو "مخضرمین" کہا جاتا ہے۔

زندگی کے نظریات کے بدلنے کے ساتھ موضوعِ شاعری بھی بدل گیا۔ جھوٹ اور مبالغہ جو شاعری کا بالعموم جزوِ لاینفک ہوا کرتا ہے اور جس کے نہ ہونے سے شعر اپنی قدر کھو دیتا ہے اور نحیف نظر آتا ہے، اسلام میں جائز نہ تھا۔ شارع اسلام (علیہ السلام) نے حقیقت کو وضعیت پر ترجیح دی اور شعراء کو کذب و مبالغہ سے باز رکھا۔

حضرت حسان بن ثابتؓ دورِ جاہلیت میں انصار کے شاعر تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد شمعِ رسالت کے پروانے بن گئے۔ مگر حضرت حسان کی شاعری کا وہ پہلو باقی نہ رہا جو زمانہ جاہلیت میں تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت حسانؓ سے سوال کیا کہ آپ کا کلام قبولِ اسلام کے بعد سُبک نظر آتا ہے۔ فرمایا "درست ہے۔ شعر کی خوبی کذب و مبالغہ سے ہے اور وہ اسلام میں کہاں جائز؟"

حضرت حسانؓ دورِ جاہلیت میں بہترین شاعر تھے۔ اصمعی کا قول ہے۔

"شعر حسان فی الجاھلیۃ اجود الشعر" کہ زمانہ جاہلیت میں حضرت حسانؓ کے اشعار بہترین اشعار تھے" آپکو شاعری اباً عن جدٍ وراثت کے طور پہ ودیعت ہوئی تھی۔ آپ کے بیٹے عبدالرحمن اور پوتے سعید بن عبدالرحمن بھی سب شاعر گذرے ہیں۔ ابو عبیدہ کا خیال ہے کہ تمام صحرا کے باشندوں میں اہلِ مدینہ کے، پھر قبیلہ عبدالقیس کے، اور پھر بنو ثقیف کے شعراء اچھے ہیں۔ اور اہلِ مدینہ میں سے سب سے بڑے شاعر حضرت حسانؓ ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت حسانؓ کی شاعری نئے قالب میں ڈھل گئی۔ شاعری میں غلو اور مبالغہ کے فقدان سے اور ان اسباب کی کمی نے جو شاعرانہ جذبات میں اشتعال پیدا کرنے کے لیئے ممد ہوتے ہیں، آپ کے ہاں الفاظ کی جزالت اور اسالیب کے تنوع کو کھو دیا تھا۔

اہل غسان سے آپ کو خاندانی تعلق تھا۔ چنانچہ ان کی مدحت وجودت میں رطب اللسان ہیں فرماتے ہیں۔

؎ یغشون حتّٰی ما تھر کلابھم
لا یسألون عن السّواد المقبل

(اہلِ غسان کے ہاں مہمانوں کی اتنی کثرت ہے۔ کہ کُتّے بھی رات کو آنے والوں کے ساتھ مانوس ہو گئے ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر نہیں بھونکتے۔)

حضرت حسانؓ کیلیئے مسجد نبوی میں منبر رکھا جاتا اور کفّارِ مکّہ کی ہجا کا دندان شکن جواب دینے کے لیئے ارشاد ہوتا۔ ابو زید القرشی، صاحب جمہرۃ اشعار العرب نے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا۔ کہ مشرکین مکّہ نے صدیق اکبرؓ کی ہجو کہی ہے۔ آپ کو یہ امر ناگوار گذرا۔ اُسی وقت منبر پر تشریف لائے۔ اور خدائے عزّ وجل کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا۔ تم میں سے کسی نے بھی صدیق اکبرؓ سے زیادہ مجھ پر احسان نہیں کیا جب تم مجھے جھٹلاتے تھے۔ تو وہ میری تصدیق کرتے تھے۔ اگر میں کسی کو خلیل بناتا، تو حضرت ابوبکرؓ کو ہی خلیل بناتا۔ پھر آپ حضرت حسانؓ کی طرف متوجّہ ہُوئے اور فرمایا۔ جو کچھ تم نے میرے اور صدیق اکبرؓ کے متعلق کہا ہے پڑھو۔ چنانچہ آپ نے کھڑے ہو کر وُہ قصیدہ عرض کیا جس کا مطلع یہ ہے

؎ اِذَا تذکّرتَ شجوًا مِنْ اخی ثِقۃٍ
فاذکُرْ اَخاکَ ابا بکرٍ بما فعلَا

(جب تو غم کی وجہ سے کسی قابلِ اعتبار بھائی کو یاد کرے تو تُو اپنے بھائی کو یاد کر، بوجہ اُن کے کاموں کے جو اُس نے سر انجام دیئے۔)

نبی اکرمؐ نے قصیدہ سُنکر فرمایا:۔

"صَدَقْتَ یَا حَسَّانُ اُدْعُ لِیْ صَاحِبِیْ - قَالَھَا ثَلَاثًا"

حضرت حسانؓ کی ہجو سب و شتم پر مشتمل نہ تھی۔ بلکہ مدافعت تھی۔ اور وہ بھی بطریق احسن۔ آنحضرتؐ اِس مدافعت سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اور حضرت حسانؓ کو فرمایا کرتے تھے۔ اُجِبْ عن رسول اللّٰہ (اللہ کے رسولؐ کی طرف سے ان کو جواب دو) اور پھر دُعا فرماتے: اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (اے خدا تُو روح القدس سے اس کی تائید فرما!) چنانچہ ایک موقعہ پر ایک قریشی نے آپؐ کی ہجو کہی۔ حسانؓ نے اجازت چاہی کہ اس کا جواب دیں مگر آپؐ نے فرمایا کہ چونکہ مَیں خود قریشی ہوں، اسلیئے شاید یہ ہجو میری طرف ہی منسوب ہو جائے۔ اس پر حسانؓ نے کہا کہ مَیں آپؐ کو اِس طرح مستثنیٰ کر لوں گا، جس طرح مکھن میں سے بال نکال لیا جاتا ہے۔

ابو سفیان (جو اعدائے رسول میں سے ایک تھے) اکثر رسول اکرمؐ کو اذیتیں پہنچاتے اور آپؐ کی شان میں فحش کلمات استعمال کرتے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے فرمایا۔ فاھجوا قریشًا فانّہٗ اشدُّ علیھا مِنْ رشق النبلِ (صحیح مسلم)

یعنی تم بھی قریش کی ہجو کہو۔ کیونکہ یہ ان پر تیر کی زد سے بھی بڑھ کر مؤثر ہوگی۔ ہجو کے اشعار ملاحظہ ہوں کس قدر ملیح ہے ؎

(۱) أَلَا أَبْلِغْ أَبَا سُفْيَانَ عَنِّي
فَأَنْتَ مُجَوَّفٌ نَخِبٌ هَوَاءُ
(۲) بِأَنَّ سُيُوفَنَا تَرَكَتْكَ عَبْدًا
وَعَبْدَ الدَّارِ سَادَتُهَا الْإِمَاءُ
(۳) هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَأَجَبْتُ عَنْهُ
وَعِنْدَ اللّٰهِ فِي ذَاكَ الْجَزَاءُ

(۱) (اے مخاطب) تو ابوسفیان کو میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ تو کمزور دل والا، بزدل اور گھبرایا ہوا ہے۔
(۲) (اور یہ بات بھی پہنچا دے) کہ ہماری تلواروں نے تجھ کو غلام بنا کر چھوڑا ہے اور ایسے گھر کا غلام بنا کر جس کے سردار لونڈیاں ہیں۔
(۳) تو نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہجو کہی تھی۔ پس میں نے آپ کی طرف سے اس کا جواب لکھا ہے۔ اور اس کی جزاء اللہ کے پاس ہی ہے۔

جب بنو تمیم کا وفد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا۔ تو آنحضرت نے حضرت حسان رضؓ کو جواب دینے کے لئے کہا۔ چنانچہ آپؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا:۔

(۱) إِنَّ الذَّوَائِبَ مِنْ فِهْرٍ وَإِخْوَتِهِمْ
قَدْ بَيَّنُوا سُنَّةً لِلنَّاسِ تُتَّبَعُ
(۲) يَرْضَى بِهَا كُلُّ مَنْ كَانَتْ سَرِيرَتُهُ
تَقْوَى الْإِلٰهِ وَبِالْأَمْرِ الَّذِي شَرَعُوا
(۳) قَوْمٌ إِذَا حَارَبُوا ضَرُّوا عَدُوَّهُمُ
أَوْ حَاوَلُوا النَّفْعَ فِي أَشْيَاعِهِمْ نَفَعُوا

ترجمہ:۔ (۱) خاندان فہر اور اُن کے بھائیوں نے ایسا طریقہ بیان کیا ہے، جس کی اتباع اور پیروی کی جاتی ہے۔
(۲) اُن کی مذکورہ سُنّت اور اس کام کو جو انہوں نے جاری کیا ہے۔ وہ ہر شخص پسند کرتا ہے، جس کی طبیعت میں اللہ تعالیٰ کا خوف ڈالا گیا ہے۔
(۳) وہ ایسی قوم ہے کہ جب نبرد آزما ہوتی ہے تو مخالف کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اور اگر اپنی جماعت کو فائدہ پہنچانا چاہے، تو وہ فائدہ پہنچا کر رہتی ہے

استیعاب میں موجود ہے کہ وفد کے اراکین اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے کہ محمدؐ کا خطیب ہمارے خطیب سے، اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے۔

دیوانِ حسّان حضرت حسان رضؓ کی شاعری کا مرقع ہے۔ اس میں مرثیے بھی موجود ہیں۔ ان میں اشارہ کی لطافت اور کنایہ کی بلاغت موجود ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرثیہ کہتے ہیں ؎

۱۔ مَا بَالُ عَيْنِكَ لَا تَنَامُ كَأَنَّمَا
كُحِلَتْ مَآقِيهَا بِكُحْلِ الْأَرْمَدِ
۲۔ جَزَعًا عَلَى الْمَهْدِيِّ أَصْبَحَ ثَاوِيًا
يَا خَيْرَ مَنْ وَطِئَ الْحَصَى لَا تَبْعُدِ
۳۔ وَجْهِي يَقِيكَ التُّرْبَ لَهْفِي لَيْتَنِي
غُيِّبْتُ قَبْلَكَ فِي بَقِيعِ الْخَرْقَدِ
۴۔ أَأُقِيمُ بَعْدَكَ بِالْمَدِينَةِ بَيْنَهُمْ
يَا لَيْتَنِي صُبِّحْتُ سَمَّ الْأَسْوَدِ

ترجمہ:۔ ۱۔ (اپنے آپ کو خطاب کر کے کہتا ہے) تیری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ سوتی ہی نہیں۔ یوں نظر

آتا ہے کہ ان میں بیمار رہنے کا سُرمہ ڈال دیا گیا ہے۔

۲۔ وہ اس مہدی اور ہادی پر بے صبری کا اظہار کر رہی ہیں، جو دُنیا سے رُوپوش ہو گیا ہے۔ وُہ ان تمام لوگوں سے افضل اور بہتر تھا، جو زمین پر چلتے تھے۔

۳۔ افسوس میرا چہرہ آپ کو مٹی سے بچاتا اور کاش آپؐ سے پہلے مَیں جنت البقیع میں دفن ہو گیا ہوتا۔

۴۔ کیا آپ کے بعد مَیں مدینہ میں ٹھہرا رہونگا؟ اس سے بہتر ہوتا کہ مجھے صبح سویرے سیاہ ناگ کا زہر پلا دیا گیا ہوتا۔

حضرت عمر بن الخطاب کا مرثیہ یُوں کہتے ہیں ؎

۱۔ علیك سلام من امیرٍ و بارکت
یَدُ اللهُ فِی ذالك الادیم الممزّقِ

۲۔ فَمَنْ یَسْعَ او یرکبْ جناحی لغامَۃٍ
لِیُدْرِك ماقدّمتَ بالامسِ یُسْبَقِ

ترجمہ:۔ ۱۔ سلامتی ہو آپ پر اے امیر اور اللہ کا ہاتھ برکت ڈالے اس جلد میں جسکو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا تھا۔

۲۔ پس جو شخص دوڑے یا شتر مُرغ کے پَر عل پہ بھی سوار ہو جائے تاکہ وُہ ان کاموں کو جنِ کو آپ نے کل ختم کیا، پالے۔ تو وُہ پیچھے رہ جائے گا۔

آنحضرت علیہ التحیات والتسلیمات کے متعلّق حضرت حسان رضؓ کا مشہور مرثیہ یہ ہے ؎

۱۔ کُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِیْ ÷ فَعَمِیَ عَلَیَّ النَّاظِرُ

۲۔ مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْیَمُتْ ÷ فَعَلَیْكَ کُنْتُ اُحَاذِرُ

ترجمہ:۔ ۱۔ تُو میری آنکھ کی پُتلی تھا۔ پس میری آنکھ میرے لئے اندھی ہو گئی ہے۔

۲۔ پس تیرے بعد جو چاہے مرے کیونکہ مجھے تو تیری مَوت کا ہی ڈر تھا۔

مَنصُور احمدؔ ظفر

غزل

دِل چھُٹا ہم سے خیالِ رُوئے یار آنے کے بعد
آئی گُلشن میں خزاں رنگِ بہار آنے کے بعد

یُوں نہ گھبراؤ صنم تُم راہ کے آفات سے
لاکھوں لالہ زار ہیں اِک خارزار آنے کے بعد

ہم تو تھے مشہور خودداری میں اے جانِ جہاں
جُھک گیا ہے سر مگر تیرا دیار آنے کے بعد

اَب سمجھتا ہے جنہیں دَرمانِ دردِ دل ظفرؔ
بھُول جائیگا اُنہیں خود ہی قرار آنے کے بعد

اقبال احمد انجم

ہمارا نصب العین

عِلم و عمل

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب اشرف المخلوقات کی حیثیت سے اِس کُرۂ ارض پر تخلیق کیا۔ تو پہلے پہل وُہ اپنے گرد و پیش سے بہت گھبرایا۔ مگر جلد ہی اُس کی عقلِ سلیم نے اُس کا ساتھ دیا۔ اور جنّتِ ارضی کی طرف راہنمائی کی۔ اُس نے بارہا شمس و قمر کو طلوع ہوتے دیکھا۔ شبِ تاریک میں تاروں کا آنکھ مچولی کھیلنا اُسے بھلا معلوم دیتا۔ ۔ ۔ ۔ ہر صُبح بادِ نسیم معطّر فضاؤں میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی اُس کی رُوح کو سرور بخشتی ۔ ۔ ۔ ۔ آبِ رواں کا دِلکش ترنّم سُن کر اُسکی رگِ جاں پھڑک اُٹھتی ۔ ۔ ۔ ۔ اُسکے مشاہدہ میں یہ بارہا آیا کہ کس طرح پُرشوخ و شنگ ہوائیں لہلہاتے ہوئے پودوں سے اُن کی عُمر بھر کی پُونجی چھین کر پیوندِ خاک کر دیتی ہیں۔ اور کس طرح خدائے لم یزل کی قدرت اُن ننّھے مُنّھے دانوں کو پھولوں اور پتّیوں کا لباس پہنا دیتی ہے۔ غرضیکہ اُسکی فطرت پکار اُٹھتی ہے ؎

تیرا ہی کام ہے تیرے سوا کس سے ممکن ہے
کلی کو، شاخ کو، پتّے کو اِک ڈالنے میں رکھ دینا

پھر آہستہ آہستہ انسانی معاشرہ میں وسعت پیدا ہونے لگی۔ اور حصولِ علم کے بعد بابِ عمل وا ہُوا۔ ۔ ۔ ۔ انسان اُس میں کُود پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ہمّتیں اُس پر مُسکرانے لگیں ۔ ۔ ۔ ۔ وُہ اپنے تحصیل کردہ علم کو عمل کے میدان میں لے آیا ۔ ۔ ۔ ۔ انسان نے شروع ہی سے اِس فطرت کی آواز ۔ ۔ ۔ ۔ علم و عمل کو اپنا نصب العین بنایا ۔ ۔ ۔ ۔ اور وُہ زندگی کی شاہراہ پر چلتے ہُوئے مسرتوں کو اپنی آغوش میں سمیٹتا چلا گیا۔ غرض صانعِ قُدرت نے جو اپنے علم پر عمل کرتے ہوئے اِس کارخانۂ عالم کو نیست سے ہست میں لایا۔ اُس نے انسانی فطرت میں یہ ودیعت کر دیا۔ کہ وہ اپنے نصب العین ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی علم و عمل پر کاربند رہے۔

اِسکے بعد ہم اُس دَور کا جائزہ لیتے ہیں کہ جب مملکتِ اسلام تمام دُنیا پر محیط تھی۔ یُوں تو اسلام سے قبل تمام علوم و فنون کے تخم موجود تھے۔ مگر اُن کی نشو و نما کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اگر کوئی تھا، تو وُہ اس پھوٹتے ہوئے پودے کی نرم نرم شاخوں کو ایک محدود حلقہ سے باہر نکلنے نہ دیتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ پادری اگر کچھ جانتے تھے تو عوام النّاس اُس سے محروم تھے ۔ ۔ ۔ ۔ برہمن اگر عالم تھے تو خود غرض ۔ ۔ ۔ ۔ اور بعض نے اپنی ناسمجھی کی بنا پر علوم کے خزانے مُقفّل کر رکھے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے اسکے برعکس دُنیا کے کونے کونے سے علم کو حاصل کر کے یکجا کیا اور اس کی

تشہیر کی۔ مثال کے طور پر اِس مقصد کے لئے البیرونی جو خود بھی علم ہیئت اور نجوم کا عالم تھا ہند میں آیا۔ . . . .
برہمن نہ چاہتے تھے کہ کوئی اُن کے علم تک رسائی حاصل کر سکے۔ الغرض البیرونی نے برہمنوں سے مباحثات کئے اور اُن سے بہت کچھ سیکھا اور اُنہیں بہت کچھ سکھایا۔ آخر برہمن یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "بھوت پریت نے اُنکے علم کو چُرا کر تشہیر کر دیا ہے۔ جس کی انہیں خبر نہیں چلی"۔ . . . .
. . . . مُسلمانوں نے قدیم فلسفہ کی کتب کو عربی میں ڈھالا اور پھر علم کیمیا۔ علم طبیعات۔ جغرافیہ۔ طب۔ تاریخ۔ جبر و مقابلہ اور ہندسہ وغیرہ علوم کو اپنے خُون سے سینچا، اور پروان چڑھایا۔ مصر کے فتح ہونے کے بعد جب مسلمانوں کی فتوحات سپین تک وسیع ہو گئیں۔ تو مسلمانوں نے اِن علوم کو یورپ میں پھیلایا اور آج یورپ کی ترقی انہیں علوم کی مرہونِ منّت ہے۔

"تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ عباسی عہد میں بہت سے مسلمان ماہر کیمیاک اور سائنسدان تھے۔ انہوں نے پانی کے گھڑیال۔ پن چکیاں اور دیگر ضروری مشینیں ایجاد کی تھیں۔ غرضیکہ مسلمان تجربہ گاہوں میں تجربات کرنے کے ہی عادی نہ تھے۔ بلکہ وُہ اُن اصولوں کو عملی زندگی میں استعمال کرتے تھے۔ جب تک مسلمانوں کا نصب العین علم و عمل رہا، انہوں نے ترقی کی۔ اور جب عملی میدان میں اُنکی ہمتیں پست ہو گئیں اور وُہ آرام طلب ہو گئے۔ تو دُوسری اقوام نے اِن علوم کو اپنا کر ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیں۔ دراصل علم و عمل لازم ملزوم ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ علم دولت ہے۔ لیکن جو دولت ایک جگہ مدفون کر دی جائے اور اُسے استعمال میں نہ لایا جائے۔ وُہ بیکار ہے۔ اور اِسی طرح جب تک علم کی دولت کو استعمال نہ کیا جائے تو وُہ بھی بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ علم اِس لئے نہیں کہ چند دماغوں میں محفوظ رہے۔ بلکہ اِس لئے ہے۔ کہ مخلوقِ خدا اُس سے فائدہ اُٹھائے۔ اِس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو پہلی وحی فرمائی، اُس میں بھی علم کی طرف خاص طور سے متوجہ کیا ہے۔ اور کئی جگہ انسان کو مناسب عمل کرنے کا بھی حکم ہے۔

. . . . اے نوجوانو! . . . . اے اِس درس گاہ کی تجوری کے یاقوت و الماس کے ڈھیرو! . . . . اے اسلام کے ہونہار فرزندو! . . . . تم نے اُس نصب العین کو اپنایا ہے جس کی حقیقت کو دُنیا بھلا چکی ہے. . . . .
. . . . تم نے آج کی دُنیا کو وُہ مے پلانی ہے کہ جس سے وُہ اپنے خالقِ حقیقی کو سمجھ جائے۔ . . . . آج وقت ہے کہ تم اُن علوم کو برسرِ کار لاؤ، جو اِس زمانہ کے مصلحِ اعظم نے تمہیں دیئے ہیں۔ . . . . دُنیا پر ثابت کر دو۔ کہ تم ہی اُن کے حقیقی نجات دہندہ ہو۔ اِس درسگاہ کے افراد کا واحد مقصد ہی یہ ہے کہ جو علوم و فنون کے پیکر یہاں سے نکلیں۔ وہ اسلام کے مجاہد اور عالم باعمل ہوں۔ . . . . آج کی دُنیا اِس بات کی مُتمنّی ہے کہ کوئی اِس آڑے وقت میں آئے، جو اُس کی مدد کرے۔ . . . . کاش کوئی آئے جس کے دِل پہ یہ لکھا ہوا ہو کہ :-

ہمارا نصب العین . . . . علم و عمل ہے۔

پروفیسر حمید اللہ ظفر

امیر خسرو دہلوی

ترکی کے لاچین قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا نام سیف الدین محمود، ترکستان کے شہر کش کے رہنے والے اور اپنے قبیلہ کے امیر تھے۔ غالباً سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں یہاں آئے۔ بڑے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ امیر خسرو سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی وفات کے وقت امیر خسرو ۸ برس کے تھے۔ والدہ مشہور امیر شاہی دس ہزاری عماد الملک کی بیٹی تھیں۔ بمقام پٹیالی (آگرہ) پیدا ہوئے۔ ذرا ہوش سنبھالا تو مکتب میں داخل ہوئے مولانا سعد الدین خطاط خوشنویسی کے لئے مقرر ہوئے لیکن انہیں کم سنی میں ہی شعر گوئی کی دھن رہتی تھی۔ ایک دن خواجہ عزیز الدین نے امتحان کے طور پر چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ انہیں ملا کر شعر کہو۔ انہوں نے فوراً رباعی موزوں کر دی۔ پندرہ بیس برس میں درسی علوم سے فارغ ہو چکے تھے۔

سن رشد کو پہنچے تو غیاث الدین بلبن کے بھتیجے کشلو خاں المعروف بھجو جو اپنے جود و کرم اور اہلِ کمال کی سرپرستی کی وجہ سے بہت مشہور تھا کے دربار سے منسلک ہوئے۔ اور دو برس تک ملازم رہے۔ اس کے بعد بغرا خاں حاکم سامانہ نے ندیم خاص بنایا۔ جب بلبن بنگال کی مہم میں بغرا خاں کو ساتھ لے گیا، یہ بھی ساتھ تھے بغرا خاں حاکم بنگال مقرر ہوا۔ تو یہ دلی کو نہ بھلا سکے۔ رخصت لیکر واپس آ گئے۔ اس دوران میں غیاث الدین بلبن کا بڑا بیٹا شہزادہ محمد قاآن دہلی آیا۔ وہ خود اہلِ کمال میں سے تھا۔ اور اہلِ کمال کا بہت قدردان تھا۔ امیر خسرو کی شہرت سن چکا تھا۔ ان کو بلا کر مجلس میں داخل کیا۔ اور جب ملتان کا حاکم ہو کر گیا تو ان کو ساتھ لے گیا۔ پانچ سال تک وہاں رہے۔ اسکے بعد ملتان پر منگولوں کا ایک عظیم لشکر حملہ آور ہوا۔ شہزادہ محمدؒ اس مقابلہ میں شہید ہو گیا۔ اور امیر خسرو گرفتار ہو گئے۔ (۶۸۳ھ)۔ امیر خسرو نے اس واقعہ پر بہت پُر درد مرثیے کہے۔

دو برس کے بعد کسی طرح رہا ہو کر واپس آئے۔ اور سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار میں شہزادہ محمدؒ کا مرثیہ پڑھا۔ سلطان اس قدر رویا اور اُسے اتنا صدمہ ہوا کہ جانبر نہ ہو سکا۔ تمام دربار میں اس حادثہ سے کہرام مچ گیا۔ اہلِ دہلی ان اشعار کو پڑھ پڑھ کر روتے تھے۔ اس کے بعد امیر دلّی سے پٹیالی آ گئے۔ بلبن کے بعد کیقباد تخت پر بیٹھا۔ اُس نے امیر خسرو کو بُلا کر دربار سے منسلک کرنا چاہا۔ امیر نے اسکی بجائے خان جہان لودھی کی جو امرائے شاہی سے تھا ملازمت پسند کی۔ وہ

اندھ کا صوبیدار ہوا۔ تو امیر کو ساتھ لے گیا۔ دو برس وہاں رہے۔ لیکن والدہ سے بے حد محبت تھی۔ اس لئے سب تعلقات چھوڑ دلی آ گئے۔ کیقباد کو عیاشی کے راستہ سے روکنے کے لئے اس کا باپ بغرا خاں حاکم بنگال دلی کی طرف روانہ ہوا۔ کیقباد نے بھی فوج تیار کرلی۔ اور مقابلہ کرنا چاہا۔ لیکن بالآخر صلح ہو گئی۔ امیر خسرو نے اسی مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا۔ جس کا نام قران السعدین رکھا۔

کیقباد تین سال بعد مرگیا۔ تو اس کا خورد سال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا۔ تین مہینہ کے بعد امرائے دربار نے اسے اتار دیا اور جلال الدین فیروز خلجی تخت پر قابض ہوا۔ یہ سلطان صاحب مذاق تھا اس لئے اہلِ کمال اس کے ندیم تھے۔ امیر خسرو سے زیادہ اس کے دربار کے لئے کون موزوں ہو سکتا تھا۔ جو عالم و فاضل مفتی و مطرب ہونے کے علاوہ ایک باکمال شاعر بھی تھے۔ جلال الدین خلجی جب عارض ممالک کے عہدہ پر تھا۔ اس وقت سے اس نے امیر خسرو کی قدر دانی کی تھی۔ اور معقول مشاہرہ کے علاوہ لباسِ فاخرہ عطا کیا تھا۔ اب انہیں ندیم خاص بنایا۔ مصحف داری اور امارت عہدہ دیا۔ اور جامہ اور کمر بند جو امراء کبار کے لئے مخصوص تھا مقرر کیا۔ امیر خسرو اسی وجہ سے امیر کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں۔ جلال الدین کی فتوحات کو تاج الفتوح کے نام سے نظم کیا۔ اس کے بعد علاؤ الدین اپنے چچا کو قتل کر کے برسرِ اقتدار آیا۔ وہ خود اہلِ کمال نہ تھا لیکن شعراء کا بہت قدر دان تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے اہلِ کمال تھے۔ لیکن امیر خسرو کے آفتاب نے سب ستاروں کو بے نور کر دیا تھا۔ اس نے امیر خسرو کا ایک ہزار تنکہ سالانہ مقرر کیا۔ علاؤ الدین کی فتوحات کو امیر نے خزائن الفتوح کے نام سے نظم کیا۔ نظامی کی پنج گنج کا جواب بھی اسی زمانہ میں لکھا چنانچہ کتاب اسی کے نام سے معنون ہے۔ آخری مثنوی ہشت بہشت ہے، جو ۷۰۱ھ میں لکھی۔ ۷۱۶ھ میں علاؤ الدین نے وفات پائی تو اس کا بیٹا شہاب الدین عمر تخت نشین ہوا تین ماہ کے بعد فوت ہوا۔ اور قطب الدین مبارک شاہ تخت پر بیٹھا۔ وہ بے حد عیاش تھا۔ لیکن اس نے امیر کی بہت قدر دانی کی اور ایک موقعہ پر ہاتھی کے برابر روپے تول کر دیئے۔ جب خسرو ملک قطب الدین مبارک کو قتل کر کے تخت پر بیٹھا تو غازی ملک نے حملہ کر کے اسے ختم کیا اور غیاث الدین تغلق کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا اس نے بھی امیر خسرو کی بہت قدردانی کی۔ بنگال کی مہم میں انہیں ساتھ لے گیا۔ واپسی پر امیر خسرو وہیں رہ گئے۔ اسی اثناء میں انہیں خبر ملی کہ ان کے پیر و مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء فوت ہو گئے۔ تو بعجلت دہلی آ گئے۔ جو کچھ زر و مال تھا۔ خواجہ صاحب پر نثار کر دیا۔ ماتمی لباس پہن کر قبر پر مجاور ہو گئے اور چھ مہینے کے بعد انتقال کیا۔ خواجہ صاحب کو بھی خسرو سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ اسے میرے پہلو میں دفن کرنا۔

امیر خسرو صاحب اولاد بھی تھے۔ ان کے ایک صاحبزادہ ملک احمد تھے جو فیروز تغلق کے دربار میں ندیم تھے۔ لیکن اعلیٰ پایہ کے شاعر نہ تھے۔ امیر خسرو کا تبرک سمجھ کر ان کو

غنیمت جانتے تھے۔ امیر خسرو کی ایک صاحبزادی بھی تھیں اور امیر خسرو نے ان کی پیدائش پر حسب دستورِ زمانہ رنج کا اظہار کیا ہے۔ امیر خسرو اگرچہ شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے لیکن یہ امر اُن کی فطرت کے خلاف تھا۔ بعض دفعہ اشعار میں اِس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ پر سلطان علاؤ الدین جیسے جابر سلطان کے بارہ میں لکھتے ہیں: ”صبح سے شام تک کسی طرح آرام نصیب نہیں ہوتا نفس خود راءکے لئے ایک اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک کھڑا رہتا ہوں“

والد نے آٹھ سال کی عمر میں خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی بیعت کرادی تھی۔ یہ تعلقاتِ عشق و محبت ترقی کرتے چلے گئے۔ چنانچہ خواجہ صاحبؒ نے ترک اللہ کا خطاب دیا تھا۔ اور کہا اگر دو لاشوں کو جمع کرنا جائز ہوتا۔ تو میں اپنی قبر میں ہی ان کو دفن کراتا۔

کہتے ہیں ایک دفعہ خواجہ صاحب چھت پر بیٹھے دریا پر ہندوؤں کی پوجا پاٹ کا منظر دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت اُن کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی اور امیر خسرو پاس تھے۔ خواجہ صاحب نے ان ہندوؤں کو دیکھ کر یہ مصرع کہا۔ ع ”ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے“

امیر خسرو نے برجستہ کہا۔ ع

”ما قبلہ راست کردیم بر طرف کجکلاہے“

جامعیّت و کمالات

ہندوستان میں بلکہ روم و ایران میں سینکڑوں برس سے اِس درجہ کا جامع کمالات پیدا نہیں ہوا۔

ان کی شاعری حیرت میں ڈالتی ہے۔ فردوسیؔ، سعدیؔ، انوریؔ، حافظ، نظیریؔ اقلیم سخن کے جم و کَے ہیں۔ لیکن ہر ایک ایک خاص میدان کا شہسوار ہے۔ فردوسیؔ کا مثنوی اور سعدیؔ کا قصیدہ سے خاص تعلق ہے۔ انوریؔ مثنوی اور غزل نہیں کہہ سکتا۔ حافظ، عرفیؔ اور نظیریؔ غزل سے باہر نہیں جا سکتے۔ لیکن خسروؔ کو غزل مثنوی و قصیدہ اور رُباعی سب پر کمال حاصل ہے۔ فردوسیؔ نے ۷۰ ہزار شعر اور صائب نے ایک لاکھ شعر کہے۔ لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں۔ اور جس قدر فارسی میں ہے اُسی قدر ہندی میں بھی تھا جس کا آج نشان نہیں ملتا۔

زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی و فارسی اصل زبان ہے، عربی پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔ اور سنسکرت کے بھی ماہر ہیں۔

نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے سب سے پہلے ہندوستان میں انہوں نے اعجازِ خسروی کے نام سے تین جلدوں میں لکھے۔ موسیقی میں وہ کمال حاصل کیا کہ کوئی دُوسرا آج تک نہیں کر سکا۔ فقر و تصوّف کا یہ عالم کہ گویا دُنیائے فانی کو کبھی نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔

جب اِسی بات پر غور کیا جائے۔ صبح سے شام تک ملازمت میں مشغول رہتے۔ کام کچھ اور ہی سُپرد تھا اور شعر و شاعری کے لئے بہت ہی کم وقت ملتا تھا۔ تو ہم ان کے کمالات پر بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔

موسیقی

اِس فن پر توجّہ کی اور کمال تک پہنچایا۔ علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں نایک گوپال اِس فن کا سب سے بڑا ماہر اُستاد تھا۔ سلطان نے اُسے بلایا

اُس نے چھ مختلف نشستوں میں اپنے کمالات دکھائے۔ امیر خسرو چھپ کر سنتے رہے۔ ساتویں دفعہ دربار میں آئے۔ نایک نے گانے کی فرمائش کی۔ امیر نے وہ تمام راگ جو گوپال نائک باندھ چکا تھا۔ ادا کر کے دکھائے۔ اور پھر اپنی خاص ایجادات سنائیں۔ گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا۔

امیر خسرو ہندی اور فارسی موسیقی سے واقف تھے۔ دونوں کے امتزاج نے ایک نیا عالم پیدا کر دیا۔ چنانچہ بیسیوں راگ ان کے ایجاد کردہ ہیں۔

تصانیف جامی لکھتا ہے کہ کم از کم ۹۲ کتابیں تصنیف کیں اشعار تین لاکھ سے زیادہ ہیں۔ اور جس قدر کلام فارسی میں ہے اسی قدر ہندی میں بھی تھا۔ مشہور تصانیف یہ ہیں۔ دیوان تحفۃ الصغر دیوان وسط الحیات۔ غرۃ الکمال۔ بقیۃ نقیہ۔ نہایت الکمال قران السعدین۔ مطلع الانوار۔ شیریں خسرو۔ آئینہ سکندری لیلیٰ مجنون ہشت بہشت۔ تاج الفتوح نہ سپہر۔ دول رانی خضر خاں۔ افضل القواعد۔ اعجاز خسروی تغلق نامہ۔ خزائن الفتوح۔ مناقب ہند۔ تاریخ دہلی اس کے علاوہ فن حساب اور موسیقی پر بھی تصانیف ہیں۔

شاعری ہندی نژاد ہونے کے باوجود ایرانی شعراء کو ان کی شاعری کا اعتراف کرنا پڑا۔ جامی لکھتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب اُن سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ ایرانی بھی ان کو طوطی ہند کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ امیر ماں کے پیٹ سے ہی شاعر پیدا ہوئے تھے۔ باپ دادا کا پیشہ اگرچہ سپہ گری تھا۔ لیکن امیر نے صغر سنی میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا۔ اساتذہ کے دیوان رکھ کر تتبع بھی کیا۔ اور اصلاح بھی لیتے رہے۔ جوانی کے جوش میں بعض دفعہ اساتذہ کی شان میں گستاخی بھی کی۔ مثلاً مطلع الانوار میں لکھتے ہیں ؎

گوکبۂ خردیم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی فگند

اپنی شاعری پر بہت بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ اُستاد وہ ہے۔ جو کسی خاص طرزِ کلام کا موجد ہو۔ کلام شعراء کے انداز پر ہو۔ صوفیوں اور واعظوں کے طریق پر نہ ہو۔ غلطیاں نہ کرتا ہو۔ اور لکھتے ہیں کہ میں درحقیقت اُستاد نہیں کیونکہ دو شرطیں مجھ میں نہیں۔ یعنی سرقہ نہیں کرتا اور کلام صوفیوں کی طرز پر نہیں۔ لیکن میں کسی طرز کا موجد نہیں۔ اور میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں۔ امیر کے کلام میں لغزشیں بھی ہیں۔ مثلاً قران السعدین اور اعجازِ خسروی میں لفظی رعایت بہت ہے۔ بعض جگہ تکلف اور آورد ہے۔ عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے امیر نے فارسی کو عربی پر ترجیح دی ہے۔

ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں کہی گئیں۔ مثلاً قلم کاغذ۔ کشتی۔ امیر نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اس کا نام انہوں نے وصف نگاری رکھا۔

تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے۔ اور امیر نے کئی نئی نئی تشبیہات پیدا کیں ؎

زہے خرامش آں نازنیں بہ عیارے
کبوترے بہ نشاط آمد است پندارے

معشوق کی چال کو کبک کی رفتار کی بجائے کبوتر کی چال کہنا ایک نئی اور زیادہ مناسب تشبیہ ہے۔

مثنوی

مثنویوں میں نظامی کے پیرو ہیں۔ رزمیہ عشقیہ۔ صوفیانہ ہر طرح کی لکھی ہیں۔

قران السعدین (سب سے پہلی ہے۔ تکلف اور آورد زیادہ ہے۔ بعض جگہ نہایت بلند اور رواں اور برجستہ ہے۔ اس میں کیقباد اور بغرا خاں کی ملاقات کا بیان ہے)۔

خمسہ میں مطلع الانوار۔ شیریں خسرو۔ لیلی مجنون آئینہ سکندری اور ہشت بہشت پانچ مثنویاں ہیں۔ پانچوں کتابوں کی تصنیف کا زمانہ سوا دو سو برس ہے۔ اور یہ قادر الکلامی اور شعر گوئی کا اعجاز ہے۔ مثنویاں امیر کا اصل میدان نہیں حکام کی فرمائشوں سے مجبور ہو کر لکھتے تھے۔ اور اس کے علاوہ نظامی کی طرح انہیں وقت میسر نہ تھا۔ ان کے اصل فرائض کے بعد بہت کم وقت نکلتا تھا۔ لہذا بعض جگہ خامی نظر آتی ہے۔ مثلاً آئینہ سکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے۔ ہشت بہشت سب سے بلند رتبہ رکھتی ہے۔ اس میں واقعہ نگاری کا کمال نظر آتا ہے۔

قصیدہ

قصیدہ میں کمال اسمٰعیل خاقانی انوری کا تتبع کیا ہے۔ تقریباً وہی تراکیب انداز واستعارے استعمال کئے ہیں۔ داخلہ مضامین پھیکے ہیں۔ کیونکہ انہیں پسند نہیں۔ لیکن قصیدہ میں اور مضامین کو لے کر زور طبع دکھاتے ہیں۔ مثلاً عید کا سماں، بہار، برسات، صبح، شام کی کیفیت وغیرہ

برسات کا بیان:

نگوں سر شاخہائے سبز گوئی در ہمہ چمنہا
زمیں کا بر در افشاں لولوئے غلطاں ہمہ بارد

یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے ہیں۔ ان کے رولنے کو جھکی ہیں۔

بعض قصائد سراسر موعظت و اخلاق سے پر ہیں۔ قصیدہ میں شاعر کی جدت کا اندازہ گریز سے ہوتا ہے۔ امیر اس میں بہت ممتاز نظر آتے ہیں۔ طلوع صبح کا بیان کرکے کہتے ہیں۔ صبح را گفتم کہ خورشید کجا است

آسماں روئے ملک جستجو نمود

قصائد میں امیر نے جو جدید مضامین لطیف۔ استعارات اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کی ہیں۔ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

غزل

سعدی نے غزل کو مستقل بنایا۔ امیر خسرو نے اسی شراب کو دوبارہ کھینچ کر تیز کر دیا۔ غزل میں درد، سوز و گداز، جذبات عشق کے معاملات، عجز و نیاز اور اس کے علاوہ زبان کا سادہ نرم، لطیف، نیاز آمیز ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ امیر خسرو نے اس میدان میں بھی ایجادات کے چمن کھلائے ہیں۔

اے آشنا کہ از رہِ کناں پند می دہی
آب از بیروں مریز، کہ آتش بجاں گرفت

اے دوست جو رو رو کر مجھے نصیحت کر رہا ہے۔ پانی جسم پر گرانے سے کیا فائدہ آگ تو میرے دل میں لگی ہے۔ ؎

حسد سے بُردی اے دشمن بہ عقل و دانش خسرو
بیا تا بر مرادِ خاطرِ خود بینی اکنونش

اے دشمن تو خسرو کی عقل و دانش سے حسد کرتا تھا۔ لیکن عشق نے اُسے تمام اوصاف سے محروم کر دیا۔ اور تیرے دل کی مراد بر آئی۔

؎ غصّہ ام می کشد اے دل سخن صبر مگو
تو چرا گوئی ازاں کار کہ نتوانی کرد

اے دل تو مجھے صبر کی نصیحت کرتا ہے مجھے تجھ پر بہت غصّہ آتا ہے۔ تو مجھے ایسی بات کیوں کہتا ہے جس پہ تو عمل نہیں کر سکتا۔

؎ غمزۂ تو بر دل سُلطان زند
ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پہ حملہ کرتا ہے۔ اور اگر تو بُرا نہ مانے تو یہ بھی کہوں کہ درویش کے دل پر بھی۔ "ورنہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے۔

؎ صبر طلب مے کنند از دلِ عاشق
ہمچو خراجے کہ بہ خراب نویسند

دلِ عاشق سے صبر طلب کرنا ایسا ہی ہے جیسے بنجر زمین پہ مالیہ لگایا جائے۔

جدّتِ اسلوب

جان ز تن بُردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

محبوب ظلم و ستم کرنے کے ساتھ بھی محبوب ہی ہے۔ محبوب کی گراں قیمت کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

؎ ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

تُو نے اپنی قیمت دونوں جہان قرار دی۔ اِسے اور زیادہ کر یہ ابھی تھوڑی ہے۔

معشوق کی آنکھ کا خمار کیسے ظاہر کیا ہے۔

؎ مے حاجت نیست مستیم را
در چشمِ تو تا خمار باشد

جب تک تیری آنکھ میں خمار ہے، نشے کے لئے مجھے شراب کی حاجت نہیں۔

معشوق کا عاشقوں کے رنج سے بے خبر ہونا۔

؎ گُل چہ داند کہ دردِ بلبل چیست
او ہمیں کار رنگ و بو داند

رخصت کے وقت معشوق کو یوں ٹھہراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا:۔

؎ می روی و گریہ می آید مرا
ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

جونہی محبوب جانا چاہے گا۔ آنسوؤں کی بارش شروع ہو جائے گی۔ اور بارش میں وُہ جا نہ سکے گا۔

سعدیؒ کا شعر ؎

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اوّل بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی؟

امیر نے اِسے یوں ادا کیا۔ ؎

جراحت جگر خستگاں چہ مے پرسی!
ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

مرزا غالب نے بھی کہا ہے۔ ؎

نظر کہیں نہ لگے اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی

بُتے و آفتِ تقوی و آخرایں نمیدانی
کہ در شہرِ مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

گویا اپنی حالت کا خیال نہیں بلکہ یہ فکر ہے کہ اِسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے۔ کیونکہ محبوب کا حُسن تقویٰ کے لئے آفت ہے۔

لفظوں کے اُلٹ پھیر سے عجیب بات پیدا کرتے ہیں۔ ؎

چشمِ بد دُور از چناں رُوئے
کہ از و چشم دُور نتواں کرد

خدا کرے نظرِ بد اُس کے چہرہ سے دُور ہی رہے کیونکہ نظر اُس سے دُور نہیں کی جا سکتی۔

ذُو معنی الفاظ سے عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں ؎

زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمی دانم!
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

میرے محبوب کی زبان ترکی ہے اور میں تُرکی نہیں جانتا۔ کاش کہ محبوب کی زبان میرے مُنہ میں ہوتی۔

ہر قسم کے نازک اور لطیف معاملات ادا کئے ہیں ؎

چند گویند کہ گہ گہ بہ دلش مے گذری
ایں حدیثے است کہ بہرِ دلِ ما نیز کنند

یعنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ خسرو! وُہ تم کو کبھی کبھی یاد کرتا ہے۔ لیکن یہ بات تو لوگ تسلّی دینے کے لئے بھی کہہ دیتے ہیں۔ اِس لئے اسے اعتبار کیونکر آئے۔

روزمرہ اور عام بول چال

دِل بسے بُردہ نکو بشناس
آنکہ مجروح ترازاں من است

تو نے بہت سے دِل لئے ہیں۔ جو سب سے زیادہ زخمی ہے وُہی میرا دِل ہے۔ یہی اسکی پہچان ہے۔

؎ بہ بازی سوئے من آمد ز شوخی دل من بستد
بدو گفتم چہ خواہی کرد گفت کارے آید

وہ کھیلتا ہوا میری طرف آیا۔ اور شوخی سے میرا دل لے لیا۔ مَیں نے پُوچھا۔ اِسے کیا کروگے۔ کہا۔ کام آتا ہے۔

؎ نرخ کردی بہ بوسہ جانے
بندہ بخرید و رائیگاں دانست

تُو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی مَیں نے خریدا اور سمجھا کہ مفت لیا۔

نئی تشبیہات:

؎ نہ رود مہ بہ اوج در شب تار
تا ز زلف تو نردباں نہ برد

چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا جب تک تیری زلف کی سیڑھیاں نہ لگائے۔

؎ می روی و گریہ می آید مرا
ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

آنسوؤں کی جھڑی کو بارش سے تشبیہہ دینے کا یہ بالکل نیا اسلوب ہے۔ معشوق جانا چاہیگا تو بارش

امیر نے اِسے یوں ادا کیا۔ ؎

جراحت جگر خستگاں چہ مے پرسی!
زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

مرزا غالب نے بھی کہا ہے۔ ؎

نظر کہیں نہ لگے اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی

بُتے و آفتِ تقوی و آخرایں نمیدانی
کہ در شہرِ مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

گویا اپنی حالت کا خیال نہیں بلکہ یہ فکر ہے کہ اِسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے۔ کیونکہ محبوب کا حُسن تقویٰ کے لئے آفت ہے۔

لفظوں کے اُلٹ پھیر سے عجیب بات پیدا کرتے ہیں۔ ؎

چشمِ بد دُور از چناں رُوئے
کہ ازو چشم دُور نتواں کرد

خدا کرے نظرِ بد اُس کے چہرہ سے دُور ہی رہے کیونکہ نظر اُس سے دُور نہیں کی جا سکتی۔

دُو معنی الفاظ سے عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں ؎

زبان شوخ من ترکی، و من ترکی نمی دانم!
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

میرے محبوب کی زبان ترکی ہے اور میں ترکی نہیں جانتا۔ کاش کہ محبوب کی زبان میرے مُنہ میں ہوتی۔

ہر قسم کے نازک اور لطیف معاملات ادا کئے ہیں ؎

چند گویند کہ گہ گہ بہ دلش مے گذری
ایں حدیثے است کہ بہرِ دلِ ما نیز کنند

یعنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ خسرو! وہ تم کو کبھی کبھی یاد کرتا ہے۔ لیکن یہ بات تو لوگ تسلّی دینے کے لئے بھی کہہ دیتے ہیں۔ اِس لئے اسے اعتبار کیونکر آئے۔

روزمرہ اور عام بول چال

دِل بسے بُردہ نکو بشناس
آنکہ مجروح ترازاں من است

تو نے بہت سے دِل لئے ہیں۔ جو سب سے زیادہ زخمی ہے وُہی میرا دِل ہے۔ یہی اسکی پہچان ہے۔

؎ بہ بازی سوئے من آمد ز شوخی دل من بستد
بدو گفتم چہ خواہی کرد گفت کارے آید

وہ کھیلتا ہوا میری طرف آیا۔ اور شوخی سے میرا دل لے لیا۔ مَیں نے پُوچھا۔ اِسے کیا کروگے۔ کہا۔ کام آتا ہے۔

؎ نرخ کردی بہ بوسہ جانے
بندہ بخرید و رائیگاں دانست

تُو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی مَیں نے خریدا اور سمجھا کہ مفت لیا۔

نئی تشبیہات:

؎ نہ رود مہ بر اوج در شب تار
تا ز زلف تو نردباں نہ برد

چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا جب تک تیری زلف کی سیڑھیاں نہ لگائے۔

؎ می روی و گریہ می آید مرا
ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

آنسوؤں کی جھڑی کو بارش سے تشبیہہ دینے کا یہ بالکل نیا اسلوب ہے۔ معشوق جانا چاہیگا تو بارش

شروع ہو جائے گی اور جا نہ سکیگا

مضمون آفرینی

زلف از اں می بُرد آں شوخ کہ شبہائے غمم
گو شود کوتہ ازاں جا ہمہ پیوند کنند

وہ اپنی زلف اس لئے تراشتا ہے کہ اگر میرے غم کی راتیں چھوٹی ہو جائیں۔ تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھائے

؎ یک شب ز رُخِ خویش چراغیم کرم کن
تا قصۂ اندوہِ تو ہم پیشِ تو خوانم

کسی رات اپنے چہرہ کا چراغ مجھے عنایت کر تاکہ اُس کی روشنی میں اپنے غم کا قصہ تجھے سُناؤں۔

صنائع

صنعت طباق یعنی اضداد ان کی مرغوب چیز ہے۔ ع

دردِ ما دادی و درمانی ہنوز

تُو نے درد دیئے اور دوا بھی تُو ہی ہے۔

؎ ز بندِ دو جہاں آزاد گردم
اگر تو ہم نشینِ بندہ باشی

مَیں دونوں جہانوں کی قید سے آزاد ہو جاؤں، اگر تُو بندہ کا ہم نشین ہو جائے۔

؎ منِ درویش را کشتی بہ غمزہ
کرم کردی الٰہی زندہ باشی

تُو نے مجھ درویش کو غمزہ سے قتل کر دیا۔ یہ تیری عنایت ہے۔ خدا تجھے عمر دراز عطاء فرمائے۔

المنار کا گذشتہ شمارہ

معاصر "خالد" کی نظر میں

"یہ رسالہ ہمارے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے ہونہار طلبہ ترتیب دیتے ہیں۔ مارچ ۱۹۶۲ء کا رسالہ ہمارے سامنے ہے۔ تازہ شمارہ کے حصۂ نثر میں پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب ایم اے اور جناب لطف الرحمٰن صاحب محمود جیسے اہلِ قلم حضرات کے مضامین بالخصوص بہت عمدہ ہیں۔ رشید احمد جاوید کا افسانہ الحب للّٰہ والبغض للّٰہ بھی خاصا کامیاب ہے۔ ڈاکٹر سلطان محمود صاحب شاہد نے "شادی" (بیہ بیدار) پر لکھ کر اُسکو غیر فانی بنانے کی قابلِ داد کوشش کی ہے۔ علم و عمل کے ماتحت دو طلبہ نے لکھا ہے۔ دونوں نے اپنے نقطۂ نظر سے اچھا لکھا ہے۔ حصۂ نظم میں حضرت قاضی اکمل صاحب۔ جناب شیخ روشن دین صاحب تنویر۔ ارشد محمود مہدی۔ مولانا قدسی اور پروفیسر نصیر احمد صاحب کا کلام پُر کشش ہے۔ میگزین کا انگریزی حصہ نصیر احمد صاحب طاہر۔ اعجاز الحق صاحب قریشی۔ منیر احمد صاحب بی ایس سی۔ نور احمد چاند وغیرہ کی نگارشات پر مشتمل ہے۔"

ماہنامہ "خالد" ۔۔۔ ۱۹۶۲ء

مرزا محمد رفیق

امتیازِ حق و باطل

"مجھے افسوس ہے کہ اکبر کا جاری کردہ دینِ الٰہی کامیاب نہ ہو سکا جو کہ اسلام اور ہندو مت کو ملانے کی ایک اچھی کوشش تھی اور سکھوں کا ابھرنا بھی اسی طرح کا ایک نتیجہ ہے۔ موجودہ ایٹمی دور میں تمام مذاہب کو اکٹھا ہو جانا چاہیئے۔"

پروفیسر ٹائن بی (جو کہ موجودہ دور کے مشہور انگریز مؤرخ ہیں) کے متذکرہ بالا بیان سے بہت سے لوگ متفق ہیں لیکن میں اس سے قطعی متفق نہیں لہٰذا میں مندرجہ ذیل سطور میں حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ امید ہے صداقت کو پہچاننے کی کوشش کی جائے گی۔

اگر ہم تیل اور پانی کو ملاتے ہیں تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اب یہ آمیزہ نہ پانی ہے نہ ہی تیل بلکہ ایک بے کار اور بے فائدہ مکروہ سی چیز حاصل ہوتی ہے۔ بالآخر اس آمیزہ کو ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کیا حق اور باطل کو ملا کر ایک نئی اور مفید چیز حاصل کرنے کی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! اور اس قسم کی کوشش کو بے ہودہ اور بے کار تصور کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ اسلام ایک مکمل دین اور واضح ضابطہ حیات ہے اور باطل عقائد کے لئے اس میں ذرہ بھر بھی گنجائش نہیں۔ کیونکہ اسلام نور ہے اور باطل تاریکی ہے۔ جہاں نور ہو روشنی ہو وہاں تاریکی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اسلام کے ابتدائی دور میں منافقین کو پاتے ہیں جو غالباً اسی طرح وہ بھی حق و باطل میں تمیز نہ کر سکے تھے اور جن کے متعلق رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ حق کی نسبت باطل کے زیادہ قریب ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دفعہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی مسجد کو مسمار کرا دیا تھا اور آئندہ ان سے خبردار رہنے کی تلقین فرمائی تھی۔ لہٰذا ہم اسلام میں باطل کا ذرہ بھر بھی وجود تصور نہیں کرتے۔

قرآن مجید میں گزشتہ اقوام کے احوال سے ثابت ہے کہ جب بھی ایسی کوشش کی گئی حق اور باطل کا مقابلہ ہوا حق کو کامرانی ہوئی اور ایسی اقوام کو نیست و نابود کر دیا گیا اور اس سے بہتر اقوام پیدا کر دی گئیں مثلاً قوم نوحؑ، قوم لوطؑ، قوم ہودؑ اور بنی اسرائیل وغیرہم۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جنگِ بدر میں ۳۱۳ مسلمانوں نے حق و باطل کے معرکے میں حق

کو قائم کردیا۔ اس فتح کو قرآن حکیم میں یوم الفرقان کہا گیا ہے۔ تاریکی اور نور اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کیا اسلام اور ہندومت کی آمیزش کی کوشش اندھیرے اور روشنی کو اکٹھا کردینے کے مترادف نہیں؟ تو پھر کیا دینِ الٰہی کی ترقی کی امید کی جاسکتی تھی؟ بہرحال اسے کوئی شخص بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوا اور آج سوائے تاریخ کے اور کہیں اس کا نشان نہیں ملتا۔ پروفیسر موصوف کی تجویز کہ اس ایٹمی دور میں تمام مذاہب کو اکٹھا ہوجانا چاہیئے۔ یہ ایک بالکل ناممکن العمل تجویز ہے۔

اگر حق اور باطل کو ملانے کی کوشش کی گئی تو ایک عجیب تضاد رونما ہوگا اور لوگ حق و باطل میں امتیاز نہ کرسکیں گے۔ نتیجۃً وہ تیسرا اور کوئی راستہ تلاش کرنے پر مجبور ہوجائیں گے وہ کیا ہے؟ وہ ہے دھریت یا سب چیزوں سے انکار! حتیٰ کہ خدا اللہ رب العالمین کو ماننے سے بھی انکار!!!

اس تجویز سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ مغربی ممالک اور اقوام نے ایک نظریہ اپنالیا ہے جس کے تحت انہوں نے حق اور باطل میں امتیاز کا مکمل ضائع کردیا اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ ہم پیدا ہوگئے ہیں اور اگر ہمارا پیدا کرنے والا ہمارے کاموں میں دخل نہیں دیتا ہم جو چاہیں کریں اس کا ہمارے کاموں سے کوئی واسطہ نہیں! اور اللہ رب العالمین کو محض بے کار اور جامد و ساکت بنا کر چھوڑ دیا

[illegible] نعوذ باللہ من ذالک

[illegible] کے علاوہ مغربی لوگوں نے [illegible] طرح مسیح کو [illegible] رکھا ہے۔ انھوں نے ایک خدا چھوڑ دیا

اور تثلیث کو اپنالیا۔ حالانکہ عیسائیت میں بھی توحید کی تعلیم دی گئی تھی۔ لیکن حق اور باطل کو جب ملا دیا گیا۔ تو ایک کی بجائے تین خدا ماننے لگ گئے اور آخرکار حق ہی کو خیرباد کہہ دیا گیا۔

اسی آمیزش کا نتیجہ ہے کہ روسی کمیونزم کا نظریۂ حیات جو کہ ایک قسم کا ردِّ عمل ہے رونما ہوا۔ کیونکہ کمیونسٹ حق اور باطل میں تمیز نہیں کرسکتے لہٰذا وہ کائنات کو ایک حادثہ قرار دے کر سمجھتے ہیں کہ سب کچھ یہی ہے۔ اسلام کے سوا کوئی اور چیز باطل کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اسلامی ضابطۂ حیات اتنا مکمل ہے کہ اس سے روحانی اور مادی معراج حاصل کی جاسکتی ہے۔ اسلام کا بنیادی اصول توحید ہے یعنی اللہ تعالیٰ سب جہانوں کا خالق اور مالک ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہی عبادت کے لائق ہے۔ انسان اور کائنات کی تخلیق ایک خاص مقصد اور نظریہ کے ماتحت کی گئی ہے۔ اور وہ نظریہ حق اور باطل کا امتیاز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ (نائب) بنایا ہے اور اس نے بہت سی اہم ذمہ داریاں اس کے سپرد کردی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حق کو بھیجنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا تاکہ حق اور باطل میں امتیاز پیدا کیا جاسکے۔

انسان اس لحاظ سے اشرف المخلوقات ہے۔ کہ اسے عقل دی گئی ہے اور دو راستے دکھائے گئے ہیں۔ ایک نیکی کا اور دوسرا بدی کا۔ اس کے

علاوہ انسان کو تدبیر (مرضی) اور عمل کا مکمل اختیار دیا گیا ہے۔ اس میں نیکی اور بدی دونوں ہی کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔

جب انسان نیک کام کرنا چاہتا ہے۔ اور مصمم ارادہ سے میدانِ عمل میں اترتا ہے۔ تو سب سے پہلے اس کو باطل قوتوں کو شکست دینا پڑتی ہے۔ پھر وہ نیک عمل کر پاتا ہے۔ لیکن فرشتوں کو صرف ایک ہی راستہ دکھایا گیا ہے۔ وہ ہے نیکی کا۔ وہ نیکی کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اب اگر فرشتوں کو تمام دیگر مخلوقات سے برتر تسلیم کر لیا جائے۔ تو انسان جو کہ بدی کو چھوڑ کر نیکی کرتا ہے کیا اشرف المخلوقات قرار نہیں دیا جا سکتا؟

جو لوگ حق نہیں پہچانتے یعنی حق کے معاملے میں گونگے ہیں بہرے ہیں اور اندھے ہیں وہ بدترین خلائق میں سے ہیں۔ لہذا ایسے لوگ شرف اور خلافت کے حقدار نہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کے لئے توبہ کے دروازے قیامت تک کھلے ہیں۔ جب بھی یہ لوگ حق کو پہچانیں گے۔ اللہ جل شانہ کی بخشش کو موجود پائیں گے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان ہی اس معیار پر پورے اتر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اپنے اعمال، قول اور کردار سے حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کر دیں اور قیامت تک ایسا ہی معیار قائم رکھیں۔ ورنہ اللہ تعالے ان سے بھی بہتر قوم پیدا کر سکتا ہے۔

اگر ہمیں کوئی شخص ایسی تجویز پیش کرے جو کہ اسلام سے ٹکراتی ہے ہمیں فوراً اس کا نوٹس لینا چاہیئے اور نورِ حق سے دنیا کو روشن کر دینا چاہیئے۔

ایک مراسلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم ایڈیٹر صاحب المنار

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رسالہ المنار پہلے بھی کئی دفعہ دیکھا ہے۔ اور اس دفعہ تو بالاستیعاب مطالعہ کا موقعہ ملا ہے میرے نزدیک ادارہ کی سعی قابلِ داد ہے۔ مضامین کا انتخاب نہایت عمدہ اور نفسِ مضمون بہت دلچسپ ہے۔ شادی، مباحثہ اور امتحان سے پہلے تو اس بارہ میں جو بن پڑے۔ دینی اور تربیتی مضامین بھی کالج کا پرچہ ہونے کے باوجود معیاری ہیں اس انتخاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادارہ کے پیشِ نظر عام کالجز کے پرچوں کی طرح رنگینی نہیں بلکہ طلباء کی دینی اور اخلاقی تربیت ہے اور کیوں نہ ہو آخر تعلیم الاسلام کالج جو ہوا۔

افسانہ نگاری افہام و تفہیم کے لئے عمدہ اسلوب ہے۔ لیکن اس اسلوب میں واقعات و جذبات کا اس طریق پر اظہار جو شرعاً یا اخلاقاً ممنوع ہو، دینی و اخلاقی روح کے خلاف ہے اس سلسلہ میں عنوان "افسانہ" کا اختتام کچھ پسندیدہ نہیں۔

"عبدالقادر یاد رہے گا" مضمون نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اندازِ بیان رواں مؤثر اور اچھوتا ہونے کے علاوہ مرحوم محسنوں کی قدر دانی کا جذبہ بہت ہی قابلِ قدر ہے۔

خاکسار: حکیم شیخ خورشید احمد

گول بازار ربوہ

بشارت الرحمٰن
فنہ اے سال دوم

پاکستان میں سیم اور تھور کے مسائل

ہمارے ملک کی زراعت خطرناک طور پر سیم اور تھور کے مسائل سے دوچار ہے۔ دریائے سندھ اور اس کے معاونوں کے علاقوں میں پانی کے خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے سیم اور تھور کی دو بڑی قباحتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ جن کے نتیجہ میں ہماری زرخیز زمین خراب ہوتی جا رہی ہے اور مغربی پاکستان کے علاقوں میں زراعت کافی کمزور پڑ گئی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ مغربی پاکستان میں ایک کروڑ بیس لاکھ ایکڑ جو کہ کل نہری زمین کا نصف ہے سیم اور تھور کا شکار ہو چکی ہے۔ اور اس میں ہر سال پچاس ہزار ایکڑ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ سندھ یونیورسٹی نے جو اندازہ لگایا ہے اس کے مطابق سیم اور تھور کے ذریعہ ہر چھ منٹ میں ہماری زرخیز زمین کا ایک ایکڑ بنجر اور بے کار زمین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سابقہ پنجاب کے اضلاع گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور اور شاہ پور اور سابقہ سندھ میں خیرپور ڈویژن اور حیدرآباد ڈویژن کے اضلاع میں بہت سے علاقے سیم اور تھور سے متاثر ہو چکے ہیں۔ اور ان علاقوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس طرح سیم و تھور کا مسئلہ ہماری حکومت اور عوام کے لئے نہایت سنگین بن گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے صدر مملکت نے سیم و تھور کو پاکستانی لوگوں کا سب سے بڑا دشمن کہا ہے۔

سیم اور تھور کے مسئلے نے پچھلے ستر سالوں میں بیراج کے ذریعہ آبپاشی کے آغاز کے ساتھ ارتقا پایا ہے۔ اس نئے نظام آب پاشی نے زمینی پانی کے اخراج اور اس کے دوبارہ جذب ہونے (Recharge) کے درمیانی توازن کو تباہ کر دیا ہے۔ دریائے سندھ کے بالائی میدانوں کے اکثر حصوں میں پانی کی سطح چھ انچ سے دو فٹ تک ہر سال بلند ہو رہی ہے۔ دریائے سندھ کی زیریں وادی میں اگرچہ زمین کے اندر پانی کی سطح میں اضافہ اتنی تیزی سے نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی اثرات کم و بیش وہی ہیں جو دریائے سندھ کے بالائی میدانوں میں ہیں۔ ۲۰ سال کے عرصہ میں زمین کے اندر پانی کی سطح ۱۰ فٹ سے ۱۵ فٹ تک بلند ہو گئی ہے۔

سیم زیر زمین پانی کی سطح بلند ہونے سے ہوتی ہے۔ جس کی دو وجوہات ہیں اوّل۔ پانی کے اخراج کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونا۔ دوم ضرورت سے زیادہ مسلسل آب پاشی کیا جانا۔ زمین کے اندر پانی کی سطح بلند ہو جانے سے دو طرح کے نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

(۱) زمین کے اندر پانی کی کثرت اور بعض علاقوں میں پانی کی سطح کے اوپر آکر جھیلوں کی صورت اختیار کر لینا اسے مقامی زبان میں سیم کہتے ہیں۔

(۲) زمین کے اندر پانی کی سطح بلند ہونے سے پانی بخارات کی شکل میں اڑ جاتا ہے۔ لیکن زمین کے اندر کے تمام نمکیات اس کی اوپر کی سطح میں آکر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح پودوں کی نشو و نما ناممکن ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ نمک ان کی جڑوں کو گلا دیتے ہیں۔ اس کو مقامی زبان میں تھور کہتے ہیں۔

سیم اور تھور کے انسداد کیلئے مندرجہ ذیل تدابیر تجویز کی گئی ہیں۔

(۱) ٹیوب ویل کے ذریعہ زائد پانی کو خارج کرنا۔

(۲) نہروں کی اندرونی سطح کو پختہ کرنا

(۳) نہروں کی بجائے کنوؤں سے آب پاشی کرنا۔

(۴) ضرورت سے زیادہ آبپاشی سے گریز کرنا۔

جہاں تک ٹیوب ویل کے ذریعہ پانی کے اخراج کا تعلق ہے۔ حکومت پاکستان نے اس مقصد کے لئے ٹیوب ویل لگانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ پہلے پانچ سالہ منصوبے میں ۹۱ء۹ کروڑ روپے رکھا اور رچنا دوآب میں ۲۲۰۰ ٹیوب ویل لگانے کے لئے مہیا کئے گئے تاکہ زائد پانی کو پمپ کر کے واپس نہروں میں ڈال دیا جائے۔ جہاں تک ٹیوب ویلوں کے لگانے کا تعلق تھا یہ تجویز تقریباً مکمل اور درست تھی۔ لیکن وسائل قوت میں کمی کی وجہ سے ٹیوب ویلوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبہ میں چار کروڑ روپوں کا مناسب علاقوں میں ٹیوب ویل نصب کرنے کے لئے انتظام کیا جائیگا۔

نہروں کی اندرونی سطح کو پختہ کرنے کے لئے بہت زیادہ اخراجات کی ضرورت ہے۔ پاکستان ابھی ان اخراجات کا حامل نہیں۔ نہری آبپاشی کی بجائے کنوؤں کے ذریعہ آبپاشی کرنا بھی کافی مہنگی ہے۔ یہ خاص طور پر وہاں جہاں زمینی پانی کم اور ناقابل رسائی ہو۔

چونکہ سیم اور تھور ضرورت سے زیادہ آبپاشی کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کا ایک علاج یہ ہے کہ نظام رسد میں تبدیلی کر کے مسلسل آبپاشی سے گریز کیا جائے۔ اور کاشتکار کو مجبور کیا جائے کہ وہ پانی کے استعمال میں کفایت سے کام لے۔ موجودہ نظام رسد کے متعلق یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف گندم ہی کی فصل میں ۳۰ سے ۵۰ فیصدی تک پانی ضرورت سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے حکومت آبیانہ پانی کی مستقل مقدار کی بجائے سیراب کی جانے والی فصل کے لحاظ سے وصول کرتی ہے علاوہ ازیں پانی کی رسد بھی غیر یقینی ہے۔ اس لئے کاشتکار قدرتی طور پر زمین کو جتنی شدت سے سیراب کر سکتا ہے کرتا ہے۔ اس لئے رسد میں تبدیلی اور باقاعدگی دونوں ضروری ہیں۔

ایسا نظام آبپاشی مرتب کرنا چاہیئے جو کہ کاشتکار کو ایک ایسی باقاعدہ پانی کی رسد کی ضمانت دے۔ جو کم از کم حقیقت میں اس کے لئے ضروری ہو۔ اور جس کے لئے ایسی شرح قیمت مقرر

کی جائے جو کہ پانی کی طلب کی زیادتی کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہے یہ شرح زائد پانی کے حجم کے مطابق ہونی چاہیئے جو کہ کاشت کار استعمال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کاشتکار اپنی تمام کوشش اور جدوجہد سے پانی کی کفایت کرے گا۔ اور اس کو بہتر طور پر استعمال کرے گا۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اوّل مغربی پاکستان میں پانی جیسے ایک کمیاب وسیلہ کا اچھا اور بہتر استعمال ہوگا۔ دوم۔ سیم اور تھور کا انسداد ہو جائے گا۔ جو کہ مسلسل آبپاشی کا نتیجہ ہیں۔

واپڈا کا پروگرام

پانی اور بجلی کے ترقیاتی ادارے نے ۲۶ سکیموں کا ایک بڑا منصوبہ تیار کیا ہے۔ جس میں سے ۱۰ سکیمیں دریائے سندھ کے شمالی حصوں میں اور ۱۶ جنوبی علاقوں میں ہونگی۔ ان سکیموں میں ۲۹۰ لاکھ ایکڑ زمین شامل ہے۔ منصوبے میں بڑی بڑی نالیاں نکاس کے لئے کھودی جائیں گی۔ اور ۲۵۰۰۰ میل لمبی مکمل نالیاں (Supplemented drains) تعمیر کی جائیں گی۔

واپڈا نے جب ابتداء میں رچنا دوآب کے علاقے میں اپنی مہم کا آغاز کیا تو کئی معترضین نے سیم و تھور کے استیصال کے لئے ٹیوب ویلوں کے افادہ پر شک کیا اور خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں پانی کی سطح پہلے ہی بہت اونچی تھی۔ موجودہ رپورٹوں نے اس بات کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے کہ یہ شک غلط تھا۔ واپڈا کو مشورہ دینے والی ایک امریکی انجینیرنگ کی فرم کا تقریباً چھ ماہ قبل ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس نے مغربی پاکستان کے چند علاقوں میں واپڈا کی ٹیوب ویل سکیموں کی ترقی کا مطالعہ کیا۔ کمیشن کی تحقیقات اس بات کا قطعی طور پر ثبوت ہیں کہ سابقہ سندھ کے علاقہ میں سیم اور تھور دور کرنے کے لئے ٹیوب ویل سکیم اصلاح زمین کے سلسلہ میں بہت کامیاب ہوئی ہے۔ یہ تحقیقات گدو بیراج اور سکھر بیراج کے تحت ۶۵ لاکھ ایکڑ اور غلام محمد بیراج کے تحت ۳۱ لاکھ ایکڑ بنجر زمین سے حاصل کی گئی ہیں۔ اس تحقیقاتی پروگرام کے لئے بیشتر سرمایہ امریکہ نے مہیا کیا ہے۔

واپڈا نے اپنا دوسرا سب سے بڑا سیم اور تھور کے انسداد اور زرعی زمین کو قابل کاشت بنانے کا پروجیکٹ رچنا دوآب میں ۳۵۰۰ مربع میل کے رقبہ میں شروع کیا ہے۔ اس پروجیکٹ کا مقصد ۴۲۷۰۰۰ ایکڑ زمین کو قابل زراعت بنانا ہے۔

واپڈا کا پروجیکٹ نمبر ۱ جو کہ ۱۹۵۹ء کے دوسرے نصف میں شروع ہوا تھا اس کے تحت ۱۵ لاکھ ایکڑ سیم اور تھور سے متاثر زمین کو قابل کاشت بنانے کے لئے تقریباً ۱۰ کروڑ روپے کی لاگت سے ۱۹۵۰ ٹیوب ویل لگانے کی تجویز کی گئی ہے۔

دوسرے پروجیکٹ کے تحت ۳۳۰۰ ٹیوب ویل لگانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اور موجودہ نہروں کو نئے سرے سے تشکیل دینے کے علاوہ واپڈا نے ۴۵۰ میل لمبی نئی سیم نالیاں تعمیر کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ یہ منصوبہ ۱۹۶۳ء میں مکمل ہو جائے گا۔ سیم اور تھور کے متعلق واپڈا کو مشورہ دینے والے انجینیرنگ

کا جو کمیشن تقریباً چھ ماہ قبل مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے اس دوران میں اپنی رپورٹ مقرر کر لی ہے۔ اور وہ عنقریب پیش کرنے والا ہے۔

واپڈا کے ان منصوبوں کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے بعد سیم اور تھور جیسے خطرناک دشمن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور ہر سال ۵۰ ہزار ایکڑ جو سیم و تھور کا شکار ہو جاتے ہیں محفوظ ہو جائینگے اور اسی طرح کئی لاکھ ایکڑ زمین جو کہ سیم اور تھور سے متاثر ہو گئی ہے اصلاح کے بعد دوبارہ قابل زراعت بن جائیگی۔ اور نہ صرف اچھی فصلیں پیدا ہونگی بلکہ زیر کاشت زمین میں بھی اضافہ ہو جائیگا۔ اور ہمارے ملک کی زراعت بہتر بن جائے گی۔

واپڈا کی سکیموں پر جو اتنی بڑی لاگت آئیگی اس کے متعلق اندازہ لگایا گیا ہے کہ سیم اور تھور کے دور کر دینے کے بعد ایک سال میں جو پیداوار میں اضافہ ہوگا وہ واپڈا کی سکیموں کی لاگت سے بڑھ کر ہوگا۔

"لذات اور عیش پرستی پر ہے اور اسلام کی بنیاد کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور روحانیت اور اخلاق کی درستی پر ہے۔ اس لئے ان دونوں کا اجتماع ناممکن ہے . . . . اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ جو غیر احمدی ہیں وہ خواہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایمان نہ لائیں پھر بھی ان کا فرض ہے کہ وہ مغربیت کی کبھی نقل نہ کریں کیونکہ یہ مسیح موعودؑ کی تعلیم نہیں۔ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بلکہ ان کے بھیجنے والے خدا کی تعلیم ہے۔" (تفسیر کبیر) (مرسلہ محمود مجیب اصغر)

مغربی تہذیب

حضرت امام جماعت احمدیہ فرماتے ہیں:۔

"جب تک ہمیں اس تہذیب مغرب سے بغض نہ ہوگا۔ اتنا بغض کہ اس سے بڑھ کر ہمیں کسی اور چیز سے بغض نہ ہو۔ اس وقت تک ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہم میں سے جو شخص بھی مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے وہ روحانی میدان کا اہل نہیں۔ جس تہذیب نے ہمارے مقدس آقا کی تصویر کو دنیا کے سامنے بھیانک رنگ میں پیش کیا ہے۔ جس تہذیب نے اسلامی تمدن کی شکل کو بدل دیا ہے۔ جب تک اس کی ایک ایک اینٹ کو ہم ریزہ ریزہ نہ کر دیں کبھی چین اور اطمینان کی نیند نہیں سو سکتے۔ وہ لوگ جو یورپ کی نقالی اور مغربیت کی رو میں بہتے چلے جاتے ہیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہمارے تن بدن میں تو ان کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر آگ لگ جانی چاہیئے۔ کیونکہ اسلام اور مغربیت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یا اسلامی ثقافت زندہ رہے گی یا مغربیت زندہ رہے گی۔ دونوں کی بنیادیں متضاد اصولوں پر ہیں اور ان کا ایک ہی جگہ پر جمع ہونا ناممکن ہے مغربیت کی بنیاد ساری کی ساری دنیاوی

ربوہ کے تعلیمی ادارے

جامعہ احمدیہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدوں کے مطابق اسلام کی سربلندی اور روئے زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع کرنے کے لئے اس زمانے میں سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا۔ آپ اپنی بعثت کی غرض بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان تمام روحوں کو جو زمین کی متفرق آبادیوں میں آباد ہیں۔ کیا یورپ اور کیا ایشیا ان سب کو جو نیک فطرت رکھتے ہیں توحید کی طرف کھینچے اور اپنے بندوں کو دین واحد پر جمع کرے۔ یہی خدا تعالیٰ کا مقصد ہے جس کے لئے میں بھیجا گیا ہوں" (الوصیت ص۶)

دنیا کی تمام سعید الفطرت روحوں کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع کرنے کے لئے ضروری تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام ہی تمام مذاہب میں سے افضل مذہب ہے۔ اور اس کی تعلیم ہی بہترین تعلیم ہے۔ چنانچہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے اسی کے قریب کتب تالیف کیں۔ اور ان سب میں اسلام کی افضلیت کے دلائل جمع کر دیئے اور روز روشن کی طرح یہ واضح کر دیا کہ اسلام کے مقابلے میں دوسرے ادیان کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ اور اگر دنیا کو خطۂ جنت بنانا ہو تو اسلام کی تعلیم کو قبول کرنا چاہیئے۔

اسلام کی اعلیٰ اور اکمل تعلیم کو تمام دنیا پر پھیلانا ایک بہت بڑا کٹھن کام تھا۔ اس کے لئے بہت سے ایسے جواں مردوں کی ضرورت تھی جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دلائل کو لے کر دنیا کے کناروں تک پہونچیں اور ان کو دنیا کے سامنے رکھیں اور ایک لمبا زمانہ اس کے لئے درکار تھا اور ضرورت تھی کہ ہر صدی میں آپ کے متبعین میں سے ایک جماعت اشاعت دین کا کام کرتی چلی جائے۔ تا آنحضور کی بعثت کا مقصد پورا ہو۔ اور دنیا پر ایک ہی دین ہو اور ایک ہی رسول کے متبع لوگ ہوں۔

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو مددگار دیئے ان میں سے دو وجود بہت قابل قدر تھے۔

(ا) حضرت مولوی نور الدین صاحب خلیفہ اول رضی اللہ تعالیٰ۔

(ب) حضرت مولوی عبدالکریم صاحب رضی اللہ تعالیٰ

یہ دونوں وجود سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دلائل کی اشاعت کرتے اور جماعت کی تربیت کے لئے کوشاں رہتے۔ ۱۹۰۵ء میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق حضرت مولوی عبدالکریم صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ وفات پاگئے ان کے فوت ہونے پر سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی کہ ضروری ہے کہ ہر زمانے میں جماعت احمدیہ میں ایسے علماء تیار ہوتے رہیں۔ جو پہلے علماء کے قائم مقام بنتے چلے جائیں۔ تاکہ اشاعت اسلام کا کام ہوتا رہے۔ چنانچہ حضور نے دسمبر ۱۹۰۷ء کے جلسہ سالانہ میں ایک پر درد تقریر فرمائی۔ اور اس میں آئندہ علماء کو تیار کرنے کی ضرورت کو بیان فرمایا۔ جس پر جماعت کے احباب نے عرض کیا۔ کہ حضور جو بھی اس کے لئے تجویز فرمائیں۔ اس کے لئے جو خرچ ہوگا۔ وہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں حضور نے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ساتھ ایک دینیات کلاس کا اجراء فرمایا اور تجویز یہ ہوئی کہ پرائمری کی تعلیم کے بعد بعض طالب علم مروجہ تعلیم کے راستے پر جائیں اور بعض بچے دینیات کی کلاس کی طرف آجائیں۔ جس میں عربی اور دینیات کی اعلیٰ تعلیم کے علاوہ دوسرے مذاہب کے متعلق بھی تعلیم دی جائے۔ اور ساتھ ہی دوسری زبانیں خلاً انگریزی اور سنسکرت وغیرہ بھی پڑھائی جائیں اور کسی حد تک سائنس بھی ہو۔ اور تقریر و تحریر کی بھی مشق کرائی جائے۔

الغرض ۱۹۰۸ء میں اس اہم ادارہ کی بنیاد رکھی گئی جس کے فارغ التحصیل نوجوانوں نے اسلام کے پرچم کو بلند کرنا تھا۔ جنہوں نے دنیا کے لئے مشعل ہدایت کو روشن کرنا اور بھولی بھٹکی روحوں کو خدا تعالیٰ کے آستانہ کی طرف لانا تھا چنانچہ شروع میں چند نوجوانوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ اور اس عظیم ادارے کا آغاز شروع ہوا۔

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد ۱۹۰۸ء کے جلسہ سالانہ میں یہ سوال پھر جماعت کے مشورہ کے لئے پیش ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی یادگار میں دینیات کی شاخ کو تعلیم الاسلام ہائی سکول سے علیحدہ کر کے ایک مستقل مدرسہ کی صورت میں قائم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس وقت اسے ایک مدرسہ کی صورت دی گئی اور اس کا نام مدرسہ احمدیہ رکھا گیا۔ بعد ازاں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ مدرسہ احمدیہ سے فارغ ہونے والے طلباء کی تکمیل تعلیم کے لئے مزید چار جماعتوں کا اضافہ کیا اور اس کا نام جامعہ احمدیہ رکھا گیا۔ اس ادارہ میں مدرسہ احمدیہ کے فارغ التحصیل مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد مبلغ بن کر نکلتے۔

ہجرت کے بعد جامعہ احمدیہ اور مدرسہ احمدیہ اکٹھے کر دیئے گئے اور جامعہ احمدیہ کی بجائے جامعہ المبشرین کا وجود عمل میں آیا۔ جہاں مبلغین کو تیار کیا جاتا اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد انکو تبلیغ عالم میں تبلیغ کے لئے بھجوایا جاتا ان دنوں جامعہ احمدیہ۔ مدرسہ احمدیہ اور جامعۃ المبشرین سب اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ اور اس ادارہ کا نام

"جامعہ احمدیہ" ہی ہے

یہ ادارہ جس اہم مقصد کے لئے قائم کیا گیا تھا اسے اس نے شاندار طور پر پورا کیا اور اس نے عظیم الشان پایہ کے وہ علماء پیدا کئے جن کا لوہا ایک دنیا کو مسلم ہے۔ چنانچہ مکرم مولانا جلال الدین صاحب شمس۔ مکرم مولانا ابو العطاء صاحب۔ مکرم مولوی محمد سلیم صاحب مکرم مولوی عبد الغفور صاحب مرحوم اور دیگر علماء سلسلہ اسی ادارہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ اور اس وقت دنیا کے کناروں تک جو تبلیغ احمدیت ہو رہی ہے اور جن لوگوں کے ہاتھوں عیسائیت بری طرح پٹ رہی ہے۔ اور عیسائی مبلغ میدان چھوڑ کر جا رہے ہیں وہ سب اسی ادارہ کے پڑھے ہوئے ہیں۔"

قبل ازیں "جامعہ احمدیہ" کو کوئی اچھی عمارت میسر نہ تھی۔ لیکن اب خدا تعالیٰ کے فضل سے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے قریب ہی ایک شاندار عمارت اس کے لئے بنوائی گئی ہے جسے تمام ظاہری ضروریات کے لحاظ سے مکمل کیا گیا ہے۔ ابتداء سے ہی اس ادارہ کی نگرانی جماعت کی بلند پایہ شخصیتیں کرتی چلی آئی ہیں چنانچہ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ، حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب، حضرت میر محمد اسحٰق صاحب اور حضرت مولوی سید سرور شاہ صاحب۔ مکرم مولوی ابو العطاء صاحب اور مکرم قاضی محمد نذیر صاحب جیسے بلند پایہ حضرات اس ادارہ کو پروان چڑھاتے چلے آئے ہیں اور آج کل یہ سعادت مکرم سید داؤد احمد صاحب کو حاصل ہے۔ جامعہ احمدیہ کی موجودہ عمارت آپ کی ہی کوشش کا نتیجہ ہے۔

جامعہ کے ہوسٹل کی عمارت بھی نہایت عمدہ ہے جہاں طلباء کے لئے رہائش کی ہر قسم کی آسائش کا انتظام کیا گیا ہے۔

اس ادارہ میں پہلے پرائمری پاس طالب علم داخل کئے جاتے تھے۔ جو دس سالہ تعلیم کے بعد مبلغ بنتے تھے لیکن اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ کم از کم میٹرک پاس طالب علم داخل کئے جائیں۔ جو چھ سال کے بعد فارغ التحصیل ہو جائیں۔

دین کی خدمت کی تڑپ رکھنے والے نوجوان بی۔ اے اور ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد بھی اس ادارہ میں آکر تعلیم پاتے ہیں اور دینی و دنیوی دونوں قسم کی تعلیم سے آراستہ ہو کر مجمع البحرین کا رنگ رکھتے ہیں۔

اس ادارہ میں صرف پاکستان کے طلباء ہی تعلیم حاصل نہیں کرتے۔ بلکہ مختلف ممالک کے طلباء ہر سال آتے رہتے ہیں چنانچہ اس وقت تک انڈونیشیا، مشرقی افریقہ۔ مغربی افریقہ۔ حبشہ، انگلینڈ۔ شام کے طلباء فارغ ہو کر اپنے اپنے ممالک میں تبلیغ اسلام میں مصروف ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اس ادارہ میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء صرف جماعت احمدیہ سے ہی تعلق رکھتے ہوں۔ بلکہ غیر مسلم حضرات جو اسلامی تعلیم کے حصول کا شوق رکھتے ہوں ان کے لئے بھی اس ادارہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اور ایسے حضرات کو بھی خوش آمدید کہا جاتا ہے

اس ادارہ میں صرف دینی تعلیم قرآن مجید، حدیث، فقہ، اور کلام کی ہی نہیں دی جاتی۔ بلکہ اس

کے ساتھ ساتھ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس ادارہ کا فارغ التحصیل ہر میدان میں کامیابی کے ساتھ کام کر سکے چنانچہ انگریزی اور دیگر ضروری تعلیمی ضروریات سے بھی اسے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے جملہ مذاہب کی تعلیم کے ساتھ اسلام کی تعلیم کا مقابلہ کر کے طلباء کو بتایا جاتا ہے کہ اسلام ہی افضل مذہب ہے۔

خدا تعالیٰ کے فضل سے اس ادارہ کو لائق اساتذہ میسر ہیں۔ اسی طرح سے اسے بہترین لائبریری بھی حاصل ہے جس سے طلباء اپنے مطالعہ کو وسیع کرتے ہیں۔

اس وقت طلباء کی تعداد ڈیڑھ صد ہے۔ جامعہ کا آرگن "البشریٰ" عربی زبان میں سہ ماہی نکلتا ہے۔ جو اکناف عالم میں عربی زبان میں تعلیم احمدیت کے لئے ایک صور کی حیثیت رکھتا ہے۔ طلباء کی جسمانی صحت اور تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے۔ کہ اس ادارہ سے فارغ التحصیل ہر طرح سے مکمل ہو کر نکلیں۔

اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ ادارہ آئندہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے گا۔ اور سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس خواہش کو احسن وجوہ پورا کرے گا کہ ہر زمانے میں ایسے علماء تیار ہوں جو ہر جہت سے مکمل ہوں اور اسلام کو دنیا میں پہنچائیں اور اس کی تعلیم کو افضل ثابت کریں۔ اور اسلام پر وارد ہونے والے اعتراضوں کا دندان شکن جواب دیں اور ہر رنگ میں اسلامی تعلیم کا نمونہ ہوں۔

ہماری جماعت کی زندگی تبلیغ سے وابستہ ہے اگر ہماری جماعت اس فریضہ کو ادا کرتی رہی۔ تو یہ اس کی زندگی کی ضمانت ہوگی۔ اور یہ کام اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ دردمند دل رکھنے والے لوگ اپنی اولادوں کو نسلاً بعد نسلٍ یہ وصیت کرتے چلے جائیں کہ وہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسلام کا جھنڈا ساری دنیا میں بلند رکھیں۔ اور اس ادارہ کے قیام سے جوق در جوق فائدہ اٹھائیں جو اسلام کی سربلندی کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اور اس کی ترقی کے لئے ہر لحظہ تیار رہیں کیونکہ اس کی ترقی سے اسلام کی ترقی وابستہ ہے۔

(ابو المنیر نور الحق)

تعلیم الاسلام ہائی سکول

مختصر تاریخ } تعلیم الاسلام ہائی سکول کی بنیاد حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ۱۸۹۸ء میں قادیان میں رکھی۔ ۱۹۴۷ء تک یہ سکول قادیان دارالامان میں اس احسن طور سے اپنے فرائض کو نبھاتا رہا کہ علاوہ نواحی علاقوں کے دور دراز سے طلباء آکر اس میں داخلہ لیتے رہے۔ چنانچہ ہجرت کے وقت سکول کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کے بعد یہ ادارہ پہلے چند ماہ تک لاہور میں اور پھر ۴ سال تک چنیوٹ میں نہایت ناساعد حالات میں اپنے فرض کی تکمیل میں کوشاں رہا۔ اپریل ۱۹۵۲ء میں سکول دارالہجرت ربوہ میں اپنی مستقل عمارت میں منتقل ہوگیا۔ آج تک سکول کو جن باوقار ہستیوں کی ہیڈ ماسٹرشپ حاصل رہی ہے

ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

(۱) حضرت مولوی شیر علی صاحب
(۲) حضرت مفتی محمد صادق صاحب
(۳) محترم مولوی صدرالدین صاحب
(۴) محترم مولوی محی الدین صاحب
(۵) محترم قاضی محمد عبداللہ صاحب
(۶) محترم صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب
(۷) محترم خواجہ عبدالقادر صاحب
(۸) محترم سید سمیع اللہ شاہ صاحب
(۹) محترم سید محمود اللہ شاہ صاحب
(۱۰) محترم صوفی محمد ابراہیم صاحب

دینی تعلیم و تربیت

حضرت بانی سکول کے ارشاد کے مطابق اس سکول کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ:

"میں مناسب دیکھتا ہوں کہ بچوں کی تعلیم کے ذریعہ سے اسلامی روشنی کو ملک میں پھیلاؤں ..... سو میں مناسب دیکھتا ہوں کہ بالفعل قادیان میں ایک مڈل سکول قائم کیا جائے اور اس کے علاوہ انگریزی تعلیم کے ایک حصہ تعلیم کی وہ کتابیں رکھی جائیں کہ جو میری طرف سے اس غرض سے تالیف ہونگی۔"

چنانچہ سکول نے اس نصب العین کو ہمیشہ سامنے رکھا ہے۔ دسویں جماعت تک عام طور پر طلباء کو قرآن مجید باترجمہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ متعدد دینی کتب کا مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ تلاوت کے انعامی مقابلے ہوتے ہیں اس کا ہی نتیجہ ہے کہ ہمارے طلباء بین الادارتی تلاوت کے مقابلوں میں انعامات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ بورڈنگ ہوس میں رہنے والے طلباء کو پانچ وقت نماز باجماعت پڑھنے کے علاوہ تہجد کا عادی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح طلباء کو اسلامی شعار کا پابند بنانے کے لئے سر پہ ٹوپی رکھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کی سختی سے پابندی کروائی جاتی ہے۔ یہ ہمارے سکول کے دینی ماحول اور ٹریننگ کا ہی نتیجہ ہے کہ اس وقت سینکڑوں اولڈ بوائز بیرونی ممالک میں تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔

عام تعلیمی حالت اور سالانہ نتائج

دینی تعلیم کو اپنا اصل مقصود قرار دینے کے ساتھ ساتھ سکول نے خدا کے فضل سے ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر دیگر علوم دنیوی کے اداروں کے مقابلہ میں اپنی نمایاں پوزیشن کو برقرار رکھا ہے۔ قادیان سے ہجرت کے بعد اور چار سال جینیوٹ گزارنے کے بعد جب سکول مستقل طور پر ربوہ میں منتقل ہوا۔ تو گوناگوں دشواریاں درپیش تھیں۔ لیکن خوش قسمتی سے اس وقت سکول کو حضرت سید محمود اللہ شاہ صاحب جیسے ہیڈ ماسٹر اور حضرت مولوی محمد دین صاحب ناظر تعلیم جیسے راہنما میسر تھے جنہوں نے سکول کے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دیا چنانچہ اس سکول کا ایک طالب علم منور احمد یونیورسٹی بھر میں اول آیا۔ اسی سال سوم پنجم۔ اور ششم پوزیشن بھی ہمارے سکول نے ہی حاصل کی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

کھیلیں۔ سکول نے اپنی تمام تر کوششیں تدریس

علم تک ہی محدود نہیں کیں بلکہ طلباء کی ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ جسمانی نشو ونما پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہے چنانچہ دیگر ہیڈ ماسٹر صاحبان کے زمانہ میں عموماً اور موجودہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے زمانہ میں خصوصاً سکول کی ٹیموں نے ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ اور دیگر مقابلہ جات میں سال بسال جو نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ وہ بلاشبہ باعث فخر و امتیاز ہیں۔ سکول دو میجر گیمز یعنی فٹ بال اور ہاکی میں ڈسٹرکٹ چیمپئن شپ جیتنے کے ساتھ ساتھ کرکٹ میں اول پوزیشن حاصل کر چکا ہے اور والی بال میں ڈویژنل فائنل تک پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ اس سال ہمارے دو کھلاڑی بورڈ کی ٹیم میں منتخب ہوئے ہیں۔ اسی طرح ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ میں سکول نے اتھلیٹکس میں بھی نمایاں پوزیشن حاصل کی۔

ادبی مجالس } طلباء میں ادبی ذوق ابھارنے اور فن تقریر میں مہارت پیدا کرنے کے لئے ہر جمعرات کو کلاس وار اور ہر ماہ کے آخر میں بحیثیت مجموعی سکول کی ادبی مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً انعامی تقریری مقابلے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ہر سال ہمارے مقرر ضلعی تقاریری مقابلوں میں اول یا دوم پوزیشن حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ امسال تو تعلیم الاسلام کالج یونین کے بین المدارس تقریری مقابلہ میں بھی سکول نے امتیاز حاصل کیا

ڈویژنل انسپکٹر میاں عبدالعزیز صاحب نے امسال سالانہ معائنہ کے دوران سکول کی بزم ادب کی صدارت فرمانے کے بعد طلباء کے فن تقریر میں مہارت رکھنے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے اس پہلو میں خصوصی توجہ دینے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

"بچوں نے سٹیج پر آکر اپنی تقریروں کو ایسے اچھے انداز سے نبھایا ہے کہ ان کی تقریروں اور انداز بیان سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی بزم ادب کے باقاعدہ اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔ اور آپ اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب کی زیر نگرانی تقریر کے فن میں کافی مہارت حاصل کر رہے ہیں۔"

نظام عمومی } تعلیم الاسلام ہائی سکول براہ راست صدر انجمن احمدیہ کے ماتحت ہے اور نظارت تعلیم اس کی نگرانی اور راہ نمائی کا کام سر انجام دیتی ہے۔ خوش قسمتی سے سکول کو صدر انجمن احمدیہ کے صدر حضرت مرزا ناصر احمد صاحب اور ناظر صاحب تعلیم حضرت مولوی محمد دین صاحب کی ذاتی توجہ اور ہمدردی حاصل ہے۔ جو اس کی حسن کارکردگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ سکول میں زیادہ سے زیادہ ٹرینڈ سٹاف مہیا کرنے کے لئے اساتذہ کو گورنمنٹ سکیل کے مطابق تنخواہیں دی جاتی ہیں چنانچہ اس وقت سکول میں دس ٹرینڈ گریجوایٹ اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو سٹاف کا مکمل تعاون حاصل ہے۔ اور سٹاف کو ہیڈ ماسٹر صاحب کی گہری ہمدردی پر کامل اعتماد ہے۔ اور یہی چیز سکول کی عام کامیابی کی ضمانت ہے

ڈویژنل انسپکٹر صاحب میاں عبدالعزیز صاحب کے الفاظ میں:-

"اساتذہ اور طلباء میں باپ بچوں کی سی شفقت اور محبت کا سلوک پایا جاتا ہے تعلیم دینے اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے استاد اور شاگرد میں ایسے ہی تعلق کی ضرورت ہوتی ہے۔"

سکول کو گردونواح میں کافی مقبولیت حاصل ہے اس کے علاوہ دور دراز سے بھی طلباء سکول میں داخل ہونے کے لئے آتے ہیں۔ بورڈنگ ہوس میں متعدد غیر ملکی طلباء بھی رہائش پذیر ہیں۔ جو سکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔ سکول کی تعداد ۹۷۱ ہے۔ سکول کی عام ترقی بہت حد تک صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی سرپرستی کی رہین منت ہے محترم پرنسپل صاحب ہر سال قرآن کریم میں اول آنے والے۔ کتب حضرت مسیح موعودؑ کے امتحان میں اوّل آنے والے اور انگریزی سپیلنگ میں اوّل آنے والے طلباء کو انعام دیتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ سکول کالج کا چھوٹا بھائی ہے۔ اور اپنے بڑے بھائی کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔

معزز مہمانوں کی آمد

جماعت احمدیہ کا مرکزی سکول ہونے کے اعتبار سے سکول کو گاہے بگاہے معزز مہمانوں کی آمد کا شرف حاصل ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے اکثر جماعت کے معزز عہدیداران اور مبلغین ہوتے ہیں جو سکول میں تشریف لاکر اپنی ایمان افروز تقاریر اور نصائح سے طلباء کو مستفیض فرماتے رہتے ہیں۔ چونکہ ہمارا سکول جماعت کا مرکزی سکول ہے۔ اس لئے تمام ملکی اور غیر ملکی اصحاب جو جماعت کا مرکز دیکھنے تشریف لاتے ہیں۔ اکثر سکول میں آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح محکمہ تعلیم کے افسران اعلیٰ سکول کی مقبولیت کے زیر اثر سکول دیکھنے تشریف لاتے رہتے ہیں۔

(سٹاف سکریٹری تعلیم الاسلام ہائی سکول)

جامعہ نصرت برائے خواتین

جامعہ نصرت کا قیام ۱۹۵۵ء میں ہوا جبکہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ نے زنانہ کالج کی اشد ضرورت کے پیش نظر اس کی بنیاد رکھی اور بنفس نفیس اس کی رسم افتتاح فرمائی جس میں آپ نے اس کالج کے انعقاد کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اس کالج کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان بچیوں کو مغربی تہذیب و تمدن کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھا جائے۔ انہیں دینیات کی تعلیم لازمی طور پر دی جائے۔ اسلامی پردہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس انداز سے ان کی تعلیم و تربیت کی جائے کہ وہ عملی زندگی میں بہترین نمونہ ثابت ہوں۔ جامعہ کا مقصد طالبات کو دینی تعلیم اور اسلامی ثقافت کی صحیح روح سے روشناس کرانا اور دنیوی رائج الوقت تعلیم دینا ہے۔ تاکہ ان کی زندگی دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم کی روشنی سے تابناک اور درخشاں ہو سکے۔ اور وہ ملک و ملت کے لئے مفید وجود ثابت ہو سکیں۔ بعدہ حضور نے جامعہ کے تابناک اور درخشندہ مستقبل کے لئے دعا فرمائی۔ انہیں کی ذات بابرکات کی مخلصانہ دعاؤں کے نتیجہ میں کالج نے سرعت کے ساتھ ارتقائی منازل طے کی ہیں۔

اپنے قیام کے پہلے چھ برس میں جامعہ نصرت

واحد اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا جس سے سرگودھا، جھنگ، میانوالی کی طالبات استفادہ حاصل کرتی تھیں۔
جامعہ نے اپنے ابتدائی مراحل محترمہ ڈاکٹر کنیز صغریٰ صاحبہ کی زیرِ نگرانی بڑی سرعت سے طے کئے۔ اور یہ انہیں کی مساعیٔ جمیلہ انتھک کاوشوں، پیہم عمل اور مسلسل تگ و دو کا نتیجہ ہے کہ ہم آج جامعہ نصرت کو ترقی کی راہوں پر گامزن دیکھتے ہیں۔ انہوں نے باوجود اپنی گراں قدر مصروفیات کے اس کالج کی فلاح و بہبود کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت صرف کیا۔ اور پہلے دو برس میں تعلیم و تدریس کا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ ان کی احسن کاوشیں یادآور ہوئیں۔ اور یہ انہیں کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے کہ جس مقصد کی خاطر کالج کا انعقاد ہوا تھا۔ وہ بطریق احسن پورا ہو رہا ہے۔ کالج کا آغاز انتہائی نامساعد حالات میں ہوا۔ عمارت اور سٹاف کی کمی ایسے حوصلہ شکن امور تھے جن پر قابو پانا آسان بات نہ تھی۔ لیکن محترمہ موصوفہ کی پیہم جد و جہد نے تائید ایزدی سے ناممکن امر کو ممکن کر دکھایا۔ اور یہ انہیں کی سعی مسلسل کا نتیجہ ہے کہ آج ہم جامعہ نصرت کو ایک منظور شدہ ڈگری کالج کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں۔

جامعہ نصرت کا موجودہ نظم و نسق پرنسپل صاحبہ کی کاوشوں کی بدولت ہے۔ انہیں کی پیہم کوشش سے کالج نے ہر لحاظ سے ترقی کی ہے۔

طالبات کی علمی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش عمل میں لائی جاتی ہے۔ علمی سرگرمیوں کے علاوہ کالج میں فنی اور ادبی ذوق کو سنوارنے نکھارنے اور صیقل کرنے کے لئے نیز علمی و ادبی شغف پیدا کرنے کے لئے اور علم سے والہانہ شیفتگی پیدا کرنے کے لئے ٹیوٹوریل گروپس اور مختلف انجمنیں قائم کی گئی ہیں۔ جن میں کالج یونین کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ جس کے زیرِ انتظام مختلف مباحثے منعقد کئے جاتے ہیں۔ اور دوسرے کالجوں کے بین الکلیاتی مباحثوں میں شرکت کی جاتی ہے۔ صدر صاحبہ یونین کی حد درجہ کی کوششوں کی بدولت یونین نے ہر لحاظ سے ترقی کی ہے۔

سابقہ سال ہمارے کالج کی مقررات نے لائل پور کے بین الکلیاتی انگریزی مباحثہ میں ٹرافی حاصل کی۔ اور امسال مذکورہ کالج کے انگریزی مباحثہ میں پہلا انعام حاصل کیا۔ بزمِ ادب کے زیرِ اہتمام ہر سال مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے۔ اور سابقہ سال بین الکلیاتی مشاعرہ کا آغاز کیا گیا۔

علمی اور ادبی لحاظ سے کالج جادۂ ترقی پر گامزن ہے۔ کالج کے شاندار نتائج اور ہر سال طالبات کا عربی میں گولڈ میڈل حاصل کرنا طالبات کے ذہن رسا اور متعلقہ لیکچرر کی مخلصانہ سعی و عمل پر دال ہے۔ سابقہ سال دو طالبات نے اردو اور تاریخ کے مضامین میں یونیورسٹی میں اول رہ کر وظائف حاصل کر کے کالج میں ایک نئی روایت قائم کی۔ امسال ثانوی بورڈ کے مقابلہ اردو مضمون نویسی میں دو انعامات حاصل کئے۔ اس سے بھی طالبات کے علمی ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ورزشی سرگرمیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ اور طالبات بورڈ اور یونیورسٹی کے کھیلوں کے مقابلہ میں بہترین کھیل کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

غرضیکہ تعلیمی، علمی اور ادبی ہر لحاظ سے جامعہ نصرت

ترقی کی راہوں پر گامزن ہے اور ہر لحاظ سے اسکے شاندار نتائج اس کی ترقی کے بہترین شاہد ہیں۔ یہ تمام امور کالج کے درخشاں اور خوش آئیند مستقبل کی غمازی کرتے ہیں۔

نصرت گرلز سکول

نصرت گرلز ہائی سکول بچیوں کی تعلیم و تربیت کے پیش نظر تقسیم ہند سے کئی سال پہلے قادیان میں قائم ہوا۔ اور اب دار الہجرت ربوہ میں نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس سکول میں پرائمری سے لے کر ہائی کلاسز تک ۱۰۰۰ سے کچھ زائد طالبات زیر تعلیم ہیں۔ ٹیچرز کی کل تعداد ۳۲ ہے۔ جن میں سے چھ ٹرینڈ گریجوایٹ ہیں۔

سلسلہ کے جملہ ادارہ جات کی طرح اس میں بھی دینیات کی تعلیم لازمی ہے۔ اس ادارہ میں بچیوں کی تعلیم و تربیت اس نہج پر کی جاتی ہے کہ وہ بڑی ہو کر ملک و ملت کے لئے مفید ثابت ہوں۔

سکول میں طالبات کے استفادہ کے لئے ایک لائبریری اور ریڈنگ روم موجود ہے۔ ریڈنگ روم میں دو روزانہ اخبارات ۲ ہفتہ وار اور ۴ ماہانہ جرائد آتے ہیں۔ بزم ادب کے تحت طالبات کو تقریری مشق کروائی جاتی ہے۔

سکول میں کھیلوں کی طرف بھی خاص توجہ دی جاتی ہے اور ورزشی مقابلے کروائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں طالبات گرل گائیڈز اور ریڈ کراس کی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لیتی ہیں۔

فضل عمر جونیئر ماڈل سکول

فضل عمر جونیئر ماڈل سکول کی تاریخ مختصر مگر قابل ستائش ہے۔ اس نوعمر ادارے کا قیام یکم دسمبر ۱۹۵۷ء کو صدر صاحبہ لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کی مخلصانہ کوشش اور لجنہ اماء اللہ کے تعاون سے ہوا۔

ربوہ میں متعدد پرائمری سکولوں کے ہوتے ہوئے ایک علیحدہ سکول کی ضرورت نہ تھی، لیکن صدر صاحبہ لجنہ اماء اللہ کی دور اندیشی و فراست نے محسوس کیا کہ وہ مبلغین جو اعلائے کلمہ اسلام کے لئے بیرونی ممالک میں جاتے ہیں۔ ان کے بچوں کی غور و پرداخت اور تربیت نہیں ہوتی جو احمدیت اپنے نونہالوں میں دیکھنا چاہتی ہے۔ چنانچہ آپ نے اس غرض کے تحت اس ادارہ کی بنیاد رکھی۔ تاکہ احمدیت کے ان ننھے ننھے سپاہیوں میں کوئی نقص نہ رہ جائے۔ اور ان میں وہ اسلامی اخلاق پیدا ہوں جو ایک مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ ادارہ مانند آغوش مادر ہے جن کا نصب العین احمدی بچوں میں شستہ اخلاق پسندیدہ اطوار اور صحیح کردار پیدا کرنا ہے۔ تاکہ بڑے ہوتے پر جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھیں تو سلسلہ کے ذمہ دار رکن اور مفید شہری ثابت ہوں۔ اور ان کی تعلیم ان کو ایسا تابناک مستقبل دے جن سے اسلام کا نور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائے۔

بچوں کی تعداد: دو کلاسز اور ۳۰ بچوں کے ساتھ اس سکول کا آغاز ہوا۔ لیکن آج بفضلہ تعالے نو کلاسز اور ۲۶۷ بچے

زیر تعلیم ہیں۔ کلاسز کے اضافہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ اس وقت ۱۱ ٹیچرز سکول میں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک تربیت حیاتی کے لئے ہیں۔ تاکہ بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما دوش بدوش ہو۔ دینیات پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ اسکے لئے ایک تجربہ کار ماہر دینیات ٹیچر کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ ایک انگلش ٹیچر کا تقرر بھی حال میں ہی ہوا ہے تاکہ بچے روانی کے ساتھ انگلش بولنا لکھ سکیں۔ بڑے ہونے پر جب وہ اعلائے حق کے لئے دوسرے ممالک میں جائیں تو انہیں انگریزی پر پورا پورا عبور حاصل ہو۔ اور وہ آسانی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نام کو سربلند کر سکیں۔

نظام عمومی } سکول ہذا کا نظام لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کی زیر نگرانی چل رہا ہے۔ محترمہ صدر صاحبہ مرکزیہ اس کی نگران خاص اور مشیر اعلیٰ ہیں۔ سکول کے اندرونی نظام کی ذمہ دار ہیڈ مسٹرس ہے۔

دیگر سرگرمیاں } تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہمارے بچے مذہبی سرگرمیوں میں بھی بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ یوم مصلح موعود اور سیرت نبوی کی مبارک تقریبات میں بچے شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اجتماع کے موقعہ پر ہمارے بچوں نے ہر پروگرام میں حصہ لیا۔ اور نمایاں پوزیشن کے ساتھ متعدد انعامات حاصل کئے۔ ہر سال بین بازار کا پروگرام بھی بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ اور اس طرح اپنی مدد آپ کے تحت بچے سکول کے لئے چندہ جمع کرتے ہیں۔

سپورٹس ڈے } سپورٹس ڈے بھی ہمارا ایک نمایاں پروگرام ہوتا ہے۔ جس میں بچے مختلف کھیلوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کے لئے سکول ہذا میں ناصرات الاحمدیہ قائم ہے اور اس سال انشاء اللہ تعالیٰ اطفال الاحمدیہ بھی قائم کی جائے گی۔

الغرض بچوں کی تربیتی۔ علمی۔ ادبی اور مذہبی ترقی کے لئے ادارہ ہر وقت کوشاں ہے اور بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسکول بفضلہ تعالیٰ ترقی پذیر ہے۔ اور اگر خدا تعالیٰ کا فضل اور احمدی بھائی اور بہنوں کا مخلصانہ تعاون شامل حال رہا تو وہ دن دور نہیں کہ یہی ننھا ادارہ ایک بہت بڑا سکول بن جائے گا۔ اور وہ مقصد جس کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا ہے ہمیشہ درخشاں رہے گا

ہیڈ مسٹرس جونیئر ماڈل سکول

میری پسند!

انتشارِ اہل معنی فیض سے خالی نہیں
بوئے خوش پھیلی اگر غنچہ پریشاں ہو گیا

حضور قلب گر حاصل نہیں تجھ کو تعجب کیا
خدا جب دل سے غائب ہو تو دل حاضر نہیں ہوتا

یوسف معنی کے جلووں کو دکھا کر عشق نے
میری بیداری کو بھی خواب زلیخا کر دیا

(مرسلہ مسعود اختر)

برکات احمد راجیکی

زمانۂ درویشی میں قادیان کے تعلیمی اداروں کی حالت

جماعت احمدیہ کی وسعت و ترقی کے ساتھ ساتھ جماعت کے دائمی مرکز قادیان کی تعلیمی حالت ترقی کرتی گئی۔ تقسیم ملک سے پہلے متحدہ پنجاب میں ریس کے اعتبار سے قادیان کا نمبر لاہور اور امرتسر کے بعد تیسرا تھا۔ اور اس میں تعلیم الاسلام ہائی سکول اور ڈگری کالج کے علاوہ لڑکیوں کے لئے نصرت گرلز ہائی سکول اور جامعہ نصرت ویمن کالج بھی قائم تھا۔ نیز مدرسہ احمدیہ اور جامعہ احمدیہ لڑکوں کو دینی تعلیم دینے کے لئے قائم تھے۔ جن میں مولوی فاضل کے علاوہ مبلغین کلاس کے امتحانات پاس کرائے جاتے تھے۔

تقسیم ملک کے بعد جب قادیان سے جماعت کا اکثر حصہ خدائی تقدیر کے ماتحت ہجرت کر گیا۔ تو ۳۱۳ درویشوں کے لئے سابقہ بلند تعلیمی معیار قائم رکھنا ممکن نہ تھا بلکہ ابتدائی پُرخطر حالات میں جبکہ یہ شہر مستقل محصوریت کی حالت میں تھا۔ اس کے لئے شہر میں چلنا پھرنا بھی بہت مشکل تھا۔ بعد ازاں فضا قدرے صاف ہوئی اور درویشوں کے اہل و عیال بھی واپس آکر یا نئی شادیوں کے نتیجہ میں قادیان میں آباد ہو گئے تو ضرورت کے مطابق لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس جاری کئے گئے۔ جو اب بفضلہ تعالیٰ مڈل تک چل رہے ہیں۔ لڑکوں کا سکول مدرسہ احمدیہ کی بلڈنگ میں قائم ہے اور اس کے اچھے نتائج نکل رہے ہیں۔ اس میں علاوہ احمدی طلباء کے غیر مسلم بھی کثیر تعداد میں تعلیم پاتے ہیں۔ موجودہ پنجاب یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق اس مدرسہ میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اور زائد تعلیم دینیات اور اردو کی بھی دی جاتی ہے۔

نصرت گرلز مڈل سکول مرزا گل محمد صاحب مرحوم کے مکان میں قائم ہے۔ اس میں بھی ... احمدی لڑکیوں کے علاوہ غیر مسلم لڑکیاں کافی تعداد میں تعلیم پاتی ہیں۔ نتیجہ بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے اچھا نکلتا ہے۔ اس کی ہیڈ مسٹرس مکرم مولوی عبدالرحمٰن صاحب امیر جماعت احمدیہ قادیان کی اہلیہ صاحبہ ہیں۔

ان ہر دو سکولوں کے علاوہ مدرسہ احمدیہ بھی جاری ہے۔ جس کے ہیڈ ماسٹر مکرم مولوی محمد ابراہیم صاحب فاضل ہیں۔ جامعہ احمدیہ کی مولوی فاضل کلاس بھی اس کے ساتھ شامل ہے۔ اس مدرسہ سے کئی طالب علم مولوی فاضل کی ڈگری حاصل کرکے میدان عمل میں نکل چکے ہیں۔ علاوہ ازیں زمانہ درویشی میں کئی ہونہار نوجوان

پرائیویٹ طور پر ادیب فاضل۔ پڑھا کر (یعنی منشی کی اعلیٰ ڈگری) اور گیانی (پنجابی زبان کی اعلیٰ ڈگری) پاس کر چکے ہیں۔ اور ان رائج الوقت زبانوں کی تعلیم کے سلسلہ کے کاموں میں مدد دے رہے ہیں۔

قادیان میں حسب سابق ایک حافظ کلاس بھی جاری ہے جس کے انچارج حافظ اللہ دین صاحب ہیں۔

علاوہ جماعت کے تعلیمی اداروں کے غیر مسلموں کے تعلیمی ادارہ جات بھی حسب ضرورت قائم ہیں تعلیم الاسلام کالج کی بلڈنگ میں سکھ نیشنل ڈگری کالج چل رہا ہے جس کے پرنسپل باوا ہرکشن سنگھ صاحب ایم۔ اے سابق پرنسپل گورو نانک کالج گوجرانوالہ ہیں۔ کلاسوالہ خالصہ ہائی سکول ہمارے ٹی۔ آئی سکول کی بلڈنگ میں جاری ہے۔ اس کے ہیڈ ماسٹر سردار سنتوکھ صاحب چیمہ بی۔ اے بی۔ ٹی ہیں۔ اسی طرح نصرت گرلز ہائی سکول کی بلڈنگ میں غیر مسلم لڑکیوں کا ہائی سکول چل رہا ہے۔ نیز پرانا ڈی۔ اے۔ وی ہائی سکول اب ہائر سیکنڈری سکول کے طور پر کامیابی سے چل رہا ہے۔ جس کے پرنسپل مسٹر راجپوت ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دن جلد آئیں جب پہلے سے بھی زیادہ شان و شوکت سے قادیان میں احمدیہ جماعت کے تعلیمی ادارے قائم ہوں۔

واللہ غالب علیٰ امرہ

ابیات مراسلہ

مکرمی و محترمی جناب مدیر اعلیٰ صاحب المنار

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

المنار کا حالیہ شمارہ خاصا کامیاب پایا۔ بالخصوص مضامین کا تنوع بہت پسند آیا۔ صرف دو مضامین ایک ہی موضوع پر تھے۔ یعنی "ہمارا نصب العین۔ علم و عمل" لیکن یہ بھی بہت حد تک تنوع فکر کے حامل تھے۔

اداریہ بھی کافی کامیاب تھا لیکن مجھے "فیل ہونے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد" کے ضمن میں اختلاف ہے۔ خصوصاً اس فقرہ میں کہ "اصل خامی ہمارے تعلیمی نظام یا اساتذہ میں نہیں بلکہ خود "طالب علم" میں ہے" میرے خیال میں محض طلباء کو کوسنا انصاف نہیں ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس ضمن میں لکھتے وقت وسعت نظر سے کام نہیں لیا گیا۔ جہاں طلبہ کی عمومی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہاں اساتذہ کی ایک محدود تعداد کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ جب تک اساتذہ اپنے فرائض کو نہیں پہچانتے اس وقت تک طالب علم کی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔

ہمارے اساتذہ کی ایک غالب اکثریت اس بات کو بھول چکی ہے کہ وہ طلباء کی روحانی تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ میرے نقطہ نظر کی تائید جناب سکرٹری صاحب تعلیم مغربی پاکستان کی حالیہ تقریر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے میونسپل گرلز کالج سرگودہا میں تقسیم اسناد کے موقعہ پر فرمائی تھی۔

غزلیات کی ترتیب میں شعراء کے مقام کا لحاظ*

* نہیں رکھا گیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر محترم اکمل صاحب کی غزل مدیر اعلیٰ کی غزل سے پہلے آتی۔ امید ہے کہ گزارشات ناگوار طبع نہیں گزریں گی۔

غلام رسول آشنا
(بی۔ اے۔ فرسٹ ایئر)

مولانا ابوالعطا جالندھری

قیامت پر ایمان

انسان کی طبیعت اس طرح پر واقع ہے کہ یا تو وہ محبت کی بنا پر اطاعت اور فرمانبرداری کرتا ہے اور یا سزا و عذاب کے خوف سے بات مانتا ہے۔ موخرالذکر اطاعت شرع میں لطاعت کی حقیقی روح سے خالی ہوتی ہے۔ اس لئے اصل اطاعت وہی ہے جس کی بنیاد محبت پر ہو۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی محبت اجاگر کرنے کے لئے اس کے حُسن اور اس کے احسان کو بار بار اور مختلف پیرایوں میں ذکر فرمایا ہے۔ قرآن مجید کو تدبر اور غور سے پڑھنے والے کو یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ کچھ طبائع گناہ آلود زندگی کے باعث قریباً مسخ ہو جاتی ہیں۔ اور محبت کے لطیف جذبات سے محروم ہو جاتی ہیں۔ انہیں بیدار کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ خوف اور تہدید سے کام لیا جائے۔ اس لئے ان لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے خدائے حکیم کی پاک کتاب میں گاہے گاہے عذاب اور سزا کی ہولناکی بھی بیان ہوئی ہے اور آنے والی تکالیف کے تصور سے ڈرایا گیا ہے۔

اسلامی عقائد میں سے قیامت کا عقیدہ انسانی اصلاح اور روحانی ترقی کے لئے ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ قیامت پر ایمان سے انسان میں ذمہ داری اور جوابدہی کا پورا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ ہر کام کے کرنے کے وقت یہ سوچتا ہے کہ آیا یہ روا ہے یا نہیں؟ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوگی یا وہ ناراض ہوگا؟ ایسے سوالات انسان کو ہر بدی سے روک دیتے ہیں۔ اور اس کو نیک راستے پر گامزن ہونے کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے۔

جو لوگ شتر بے مہار ہوتے ہیں اور آخرت کی زندگی اور قیامت کے اعتقاد سے غافل ہوتے ہیں وہ سب کچھ اسی جہان کو سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی سب طاقتوں کو دنیا کمانے اور دنیا کے عیش و عشرت کی داد دینے میں صرف کر دیتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

"ایہہ جگ مٹھا اگلا کس ڈٹھا"

کہ یہی جہان ہے اگلے جہان کو کون جانتا ہے۔ گویا ان کا عقیدہ اس مصرعہ کے مطابق ہوتا ہے ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ایسے لوگ مادی نعمتوں پر مکھیوں کی طرح گرتے ہیں اور دن رات انہی کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان لوگوں کو بلند اخلاق اور روحانی تقاضوں سے کوئی سروکار نہیں

ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی محبت بلکہ اس کی ہستی کے عقیدہ سے بھی یہ لوگ انکاری ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قرآن مجید نے روحانی مردے قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان کی ساری تگ و دو صرف دنیا کے حصول کے لئے ہوتی ہے۔ ضل سعیہم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انہم یحسنون صنعاً۔

قیامت پر ایمان لانا انسان کی روحانی زندگی کے لئے بنیادی چٹان کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ جب تک انسان کو یہ یقین نہیں کہ وہ مرنے کے بعد اپنے اعمال کے متعلق جوابدہ ہے تو اس کے اعمال میں توازن اور درستی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر جب تک انسان کو آخرت میں لامحدود روحانی ترقیات کا یقین نہ ہوگا وہ کس طرح انتہائی قربانی کر سکے گا۔ اور کس اپنے اعمال کے مادی بدلہ کے لئے بے تاب نہ ہوگا۔

دراصل قیامت پر ایمان ہی انسان کو اعلیٰ اعمال، عمدہ اخلاق اور قربانی و ایثار پر آمادہ کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی محبت کے لئے اس کے دل میں والہانہ جذبات پیدا کرتا ہے۔ بنی نوع انسان کی خاطر اس کو ایثار و قربانی کی توفیق دیتا ہے۔ غرضیکہ انسان کی انسانیت کی تکمیل کے لئے قیامت کا عقیدہ ایک لازمی چیز ہے۔ قیامت کا اعتقاد انسان کو گناہوں سے بچاتا اور نیکیوں پر قائم کرتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے قیامت پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔

ملفوظات

دینِ کامل

"یہ خدا کا فضل ہے جو اسلام کے ذریعہ مسلمانوں کو ملا اور اس فضل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے جس پہلو سے دیکھو مسلمانوں کو بہت بڑے فخر اور ناز کا موقعہ ہے۔ مسلمانوں کا خدا پتھر، درخت، حیوان، ستارہ یا کوئی مُردہ انسان نہیں ہے بلکہ وہ قادرِ مطلق خدا ہے جس نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے پیدا کیا اور حیّ و قیوم ہے۔

مسلمانوں کا رسول وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کی نبوت اور رسالت کا دامن قیامت تک دراز ہے۔ آپ کی رسالت مردہ رسالت نہیں ہے بلکہ اس کے ثمرات اور برکات تازہ بتازہ ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں جو اس کی صداقت اور ثبوت کی ہر زمانہ میں دلیل ٹھہرتے ہیں۔

کتاب دی تو ایسی کامل اور ایسی محکم اور یقینی کہ لا ریب فیہ اور فیہا کتب قیمہ اور آیات محکمات قولٌ فصلٌ۔ میزانٌ۔ مہیمنٌ

غرض ہر طرح سے کامل اور مکمل دین مسلمانوں کا ہے جس کے لئے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً کی مُہر لگ چکی ہے۔ پھر کس قدر افسوس ہے مسلمانوں پر کہ وہ ایسا کامل دین جو رضائے الٰہی کا موجب اور باعث ہے رکھ

ہم کیسے بے نصیب ہیں اور اس دین کے برکات اور ثمرات سے حصہ نہیں لیتے۔" (مرسلہ برکت اللہ طاہر)

ڈاکٹر محمد رمضان

چائے نوشی

انسان کچھ ایسا ظلوماً جہولاً واقع ہوا ہے کہ باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہ نمائی ہونے اور عقلِ سلیم رکھنے کے بعض اوقات وہ ایسی گمراہی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ آجکل چائے نوشی کو ہی لے لیجئے جو ایک نشہ آور دوائی ہے۔ لیکن دنیا کا اکثر حصہ باوجود صحت مند ہونے کے اس میں کچھ اس طرح مبتلا ہے کہ اسنے اپنے آپکو خود بخود بیمار بنا رکھا ہے اور پھر لطف یہ کہ شرابی یا افیونی کی طرح وہ اپنے آپکو بیمار نہیں سمجھتا۔ بلکہ تھوڑے وقت کے لئے جبکہ نشہ[1] کا ابتدائی دور ہوتا ہے۔ وہ خود کو رستم زماں اور افلاطون دوراں خیال کرتا ہے (ایں چہ بوالعجبی است) گو بعد کے دور میں جب شیخی کرکری ہو کر حسیں ماؤف اور سستی و کاہلی مستولی ہو جاتی ہے۔ تو پھر وہ عجیب بے چارگی اور طرح طرح کے عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

شراب کی طرح شریعت میں ایسے دوسرے نشوں مثلاً افیون۔ بھنگ۔ چرس۔ کوکین۔ تمباکو (معہ زردہ اور نسوار کے) اور چائے وغیرہ کے متعلق اگرچہ کوئی صریح نص تو موجود نہیں۔ لیکن عن اللغو معرضون کے ماتحت مومن کا یہی کام ہے کہ وہ طریق اختیار کرے جسے نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختیار کیا یا اس کے کرنے کا ارشاد فرمایا۔ اور اس سے مجتنب رہے۔ جس سے آپ نے منع فرمایا کہ سب برکت اسی میں ہے۔

لقد کان فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔

دوسرے علم الابدان اور علم الادیان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ لہذا اگر پہلے سے یہ ثابت ہو کہ کسی چیز کا استعمال مضر صحت ہے تو اس سے بچنا دین کا ہی حصہ سمجھا جائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ عادی لوگ

---

[1] اگرچہ یہ نشہ شراب جو ام الخبائث ہے اور جسے قرآن مجید نے حرام قرار دیا گیا ہے کی طرح شدید تو نہیں۔ لیکن اپنی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے انہیں ادویات سے تعلق رکھتا ہے جو استعمال کے بعد پہلے دماغ اور حسوں کو تحریک کرتی ہیں۔ اور بعد میں انہیں ماؤف یا ماؤف سا کر دیتی ہیں۔ نشہ کے معنی ایسی اشیاء سے متاثر ہونا ہے جس سے دماغ اور حسوں کا توازن قائم نہ رہے خواہ وہ اکل و شرب سے تعلق رکھتی ہوں یا دیکھنے اور پڑھنے سے مثلاً سینما بینی اور ناول و فکشن خوانی یا جذبات و احساسات کی زیادتی اور کمی سے مثلاً غم و غصہ کی شدت ۔۔۔ وغیرہ)

دوسری چیزوں کی طرح اس میں بھی نکالنا اور غلط اجتہاد
کرنا شروع کردیں۔ آخر بہت سے مسلمان شراب پیتے
ہیں اور ساتھ ہی دوسروں کو اس کی تلقین بھی کرتے
ہیں کہ تھوڑی تھوڑی پینے میں حرج نہیں بلکہ صحت
کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں
اس کی حرمت کا حکم موجود ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالےٰ نے
ایک دفعہ قادیان میں جلسہ سالانہ کے موقعہ پر چائے کے
متعلق فرمایا تھا کہ مومن تو مجاہد ہوتا ہے۔ اسے کسی ایسی
چیز کی عادت نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر کبھی لڑائی کا
وقت آجائے۔ تو جہاں دوسرے لوگ اپنا اسلحہ
لئے جا رہے ہوں گے۔ یہ صاحب یعنی چائے کے عادی
اپنا سماوار اٹھائے جا رہے ہوں گے۔

یہ ایسی اشیاء کا ابتدائی خوشی کا احساس ہی ہے
جو انسان کو رفتہ رفتہ ان کا عادی بنا دیتا ہے۔ اور اسے
پتہ بھی نہیں لگتا کہ وہ ایک ایسی عادت اور مصیبت
میں گرفتار ہو رہا ہے جس سے بعد میں چھٹکارا بہت
مشکل ہو جائے گا۔ لہذا اشیاء کے استعمال اور ان
سے متمتع ہونے میں اس قدرتی قانون کو کبھی فراموش
نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ وہ جہاں ایک حالت میں مفید ہیں
وہاں دوسری میں نقصان دہ بھی ہیں۔ مثلاً انگور، گندم،
جَو کو اگر صحیح صورت میں استعمال کیا جائے تو وہ انسان
کے لئے صحت بخش ہیں۔ لیکن اگر انہیں گلا سڑا کر یعنی شراب
بنا کر استعمال میں لایا جائے۔ تو وہ مضرت رساں ہیں۔
چائے خصوصاً سرد ملکوں میں اچھے مشروبات میں
سے ہے۔ بشرطیکہ اسے آگ پر جوش نہ دیا جائے۔ بلکہ
چٹکی بھر پتی کو کیتلی میں ڈال کر اوپر سے ابلتا ہوا پانی ڈال
دیا جائے اور کیتلی ڈھکنے سے فوراً بند کر دی جائے
اس صورت میں چائے کی صرف خوشبو پانی میں حل ہو گی
جس کا استعمال منع نہیں۔ جیسا کہ موسم گرما میں ہم شربت
میں کیوڑہ وغیرہ ملا لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر ہم چائے
کو آگ پر جوش دینگے۔ تو اس کے سمیات ۔۔۔۔
(TANINE THENINE etc) پانی میں
حل ہو جائیں گے۔ یہ سمیات ادویات میں شامل ہیں جو بیماروں
کو استعمال کرائے جاتے ہیں نہ کہ تندرستوں کو۔ گرمیوں میں
ایسی چائے کا استعمال رفتہ رفتہ انسان کو اس کا ایسا عادی
بنا دیتا ہے۔ جسے بعد میں ترک کرنا اگر ناممکن نہیں۔ تو
بہت مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ جیسے تمباکو وغیرہ۔

جوش دی ہوئی چائے کے نقصانات بھی بہت
ہیں۔

(۱) عمل انہضام خراب ہو جاتا اور آخر کار قبض غلبہ
پا لیتی ہے۔ جسے دوسرے نشوں کی طرح چائے سے
دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ BED-TEA
کے یہی معنے ہیں کہ بغیر اس کے اجابت نہیں۔ اسی طرح
پبلک ٹٹیول میں فرش پر جو سگریٹ ہی سگریٹ نظر آتے
ہیں وہ بھی اسی وجہ سے پئے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں
میں ایسی چیزوں کے استعمال سے اجابت کی قدرتی تحریک
مفقود ہو جاتی ہے۔

(۲) دل کی دھڑکن اور آخر کار مختلف عوارض
(۳) اعصابی عوارض مثلاً زیادہ باتیں کرنا۔ طبیعت کا

چڑچڑاپن۔ معمولی سی بات پر غصہ میں آجانا۔ فراموشی کا بڑھ جانا اور جذبات پر قابو نہ رہنا۔

(۴) طبیعت میں لطیف حسیں ماؤف ہو کر طبیعت میں انشاط نہیں رہتی اور کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ زندگی کا پروگرام بالکل الٹ پلٹ ہوجاتا ہے۔ آدمی دن کو عموماً لیٹا اور سویا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے رات کو نیند بہت کم آتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ بے خوابی بڑھ کر زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔ سبزیوں اور دودھ سے جن پر زندگی کا خصوصاً بچوں کی صحت کا بہت انحصار ہے نفرت ہوجاتی ہے۔ اور مائیں مجبوراً دودھ میں چائے ملاتی ہیں۔ سر درد اور اعصاب شکنی کی عام شکایت رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے مزید چائے پینے کی تحریک ہوتی ہے۔ غرضیکہ جسم اور دماغ کی تمام چولیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں جس کا انسان کی اخلاقی اور روحانی حالتوں پر بھی اثر ہوتا ہے۔ قوت برداشت کم ہوجاتی ہے۔ اسی وجہ سے ہمت و استقلال سے نیکی بجالانے اور بدی کے مقابلہ کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔

چونکہ اس لامذہبیت اور دجالی زمانہ میں انسان کا تعلق اپنے خالقِ حقیقی سے اٹھ گیا ہے۔ اس لئے وہ اس فطرتی تقاضا کو پورا کرنے کے لئے جھوٹی اور مصنوعی چیزوں کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن یہ چیزیں صحیح معنوں میں نہ اسے اطمینانِ قلب دیتی ہیں۔ اور نہ ہی ذہنی سکون۔

— "ہر بچہ اپنے ساتھ یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا" (ٹیگور)

رسالہ المنار

پر

معاصر الفضل کا تبصرہ

یہ مجلہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے طلباء کا ترتیب کردہ ہے۔ زیر نظر شمارہ اردو کے ۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس شمارہ میں اداریہ کے کالم کو بہت عمدگی سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ مدیران باوجود طالب علم ہونے کے اچھی قابلیت رکھتے ہیں۔ مضامین میں سے پروفیسر صوفی بشارت الرحمٰن صاحب کا مضمون

الحکمۃ ضالۃ المومن

اور عبدالسمیع صاحب قریشی کا مضمون "عبدالقادر یاد رہے گا" قابلِ تعریف ہیں۔ شادی کے عنوان پر ڈاکٹر شاہد صاحب نے خوب لکھا ہے۔ رشید احمد جاوید اور زرتشت منیر کے افسانے خاصے کامیاب ہیں۔

منظوم کلام میں سے صاحبزادہ سید ابوالحسن صاحب قدسی اور ارشد ترمذی کا فارسی کلام قابلِ داد ہے۔ بہر حال مجلہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔

— "میں نے بلندی کو عاجزی اور فخر کو فقر میں پایا" (اویس قرنیؓ)

— "جلدی معاف کرنا شرافت اور جلدی انتقام لینا کمینگی ہے۔" (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

ملک صغیر احمد خان فرخ

رباعیاتِ سرمد کی چند خصوصیات

۱- وحدتِ شہود:

سرمد بھی دیگر صوفیاء کی طرح وحدتِ شہود کا قائل ہے۔ اس نے اس خیال کو متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ اور ہر بار اسلوبِ بیان جدت انگیز ہے مثلاً

چوں لفظِ 'ما' 'و' 'اورا' بنگر
چوں چشم و نگہ جدا و یکجا بنگر
یک دم ز کسے جدا نیابی ہر گز
مانند گل و پوست بہ ہر جا بنگر

عاشق و عشق و بت و بتگر و عیارے کیست
کعبہ و دیر و مساجد ہمہ جا تاریکیست
گر در آئی بہ چمن وحدت یک رنگی بیں
غور کن عاشق و عشق و گل و خار یکیست

۲- جبر و قدر:

جبر و قدر کے بارہ میں سرمد نے اعتدال کے مسلک کو اختیار کیا ہے۔ وہ انسان کو با اختیار تسلیم کرتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کی قوت و اختیار کے سامنے اس کی قوت و اختیار کی کوئی حقیقت نہیں:-

سر رشتۂ اختیار با یار بگذار
خود را ز غم و محنتِ بیہودہ بر آر
ایں عمر گرامی کہ تمامی ہوس است
با یار بسر ببر بغفلت مسپار

افسوس بہ تدبیر نہ بردیم پناہ
ز اندیشۂ و تدبیر شد احوال تباہ
مغرور مشو بہ قوت و قدرتِ خویش
لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ

۳- عشقِ الٰہی:

سرمد کو ہر چیز میں خدا تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے اور ہر چیز سے محبت کی بو آتی ہے۔ جب وہ عشق و محبت کی واردات بیان کرتا ہے، تو سر تا پا اسی میں ڈوب جاتا ہے:-

ہر چند گل و خار دریں باغ خوش است
بے یار دل از باغ نہ از راغ خوش است
چوں خون دلم لالہ ببیں در رنگ است
ایں چشم و چراغ نیز با داغ خوش است

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند
سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار
ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

۴- ذکرِ الٰہی

سرمد اہلِ دل میں ہونے کے باعث اپنے محبوبِ حقیقی کے ذکر میں تسکین قلب پاتا ہے:-

دل را بخیال یار خوشنود بدار
سررشتہ ایں دولت سرمد بکف آر
گنج است کہ رنجش نبود آخر کار
سود است کہ سودش بود افزوں ز شمار

دل را بخیال او ہم آغوش بکن
خود را بفلک ز اوج ہمدوش بکن
ایں حرف ز مشتق فراموش مکن
یاد دو جہاں ز دل فراموش بکن

۵- رضائے الٰہی

اس مضمون کو سرمد نے متعدد رباعیات میں ادا کیا ہے۔ اور زیادہ تر ان میں اپنی کیفیت بیان کی ہے:-

یک لحظہ اگر دل حزینت بدہند
آسودگی روئے زمینت بدہند
گر مہر خداست نقش بر خاتم دل
عالم ہمہ در زیر نگینت بدہند

نابود شدم بود نے دانم چیست
اخگر شدم و دود نے دانم چیست
دل دادم جان دادم و ایماں دادم
سود است مگر سود نے دانم چیست

ہر چند کہ صد دوست بمن دشمن شد
از دوستی یکے دل ایمن شد
وحدت بگزیدیم و ز کثرت رستیم
آخر من از و شدم و او از من شد

۶- وصالِ الٰہی

سرمد کے دل میں دیدارِ الٰہی کی جو تڑپ ہے اس کو یوں بیان کرتا ہے:-

دُنیا ز کنم طلب کہ کمتر ز خس است
بے دولت دیدار تو ایں ہم قفس است
خواہم وصالم و ہمیں است سخن
درخانہ اگر کس است یکحرف بس است

درسِ توحید

(از حضرت بانیِ سلسلہ احمدیہ)

وُہ دیکھتا ہے غیروں سے کیوں دِل لگاتے ہو
جو کچھ بُتوں میں پاتے ہو، اُس میں وُہ کیا نہیں
سُورج پہ غور کر کے نہ پائی وُہ روشنی
جب چاند کو بھی دیکھا، تو اُس یار سا نہیں
واحد ہے لاشریک ہے اور لازوال ہے
سب مَوت کا شکار ہیں اُس کو فنا نہیں
سَب خَیر ہے اِسی میں کہ اُس سے لگاؤ دِل
ڈھونڈو اُسی کو یارو بُتوں میں وفا نہیں
اِس جائے پُرعذاب سے کیوں دِل لگاتے ہو
دوزخ ہے یہ مقام یہ بُستاں سرا نہیں

اہلِ وفا ہو جاؤ

از حضرت امامِ جماعت احمدیہ اطال اللہ بقاءہٗ

عہد شکنی نہ کرو اہلِ وفا ہو جاؤ
اہلِ شیطاں نہ بنو اہلِ خدا ہو جاؤ

گرتے پڑتے درِ مولیٰ پہ رسا ہو جاؤ
اور پروانے کی مانند فدا ہو جاؤ

جو ہیں خالق سے خفا اُن سے خفا ہو جاؤ
جو ہیں اُس در سے جُدا اُن سے جُدا ہو جاؤ

حق کے پیاسوں کیلئے آبِ بقا ہو جاؤ
خشک کھیتوں کیلئے کالی گھٹا ہو جاؤ

سُرخرو روئے داورِ محشر جاؤ
کاش تم حشر کے دن عہدہ برا ہو جاؤ

بادشاہی کی تمنّا نہ کرو ہرگز تم!
کوچۂ یارِ یگانہ کے گدا ہو جاؤ

دمِ عیسیٰ سے بھی بڑھ کر ہو دعا تم میں اثر
یدِ بیضا بنو، موسیٰؑ کا عصا ہو جاؤ

رہِ مولیٰ میں جو مرتے ہیں وہی جیتے ہیں
موت کے آنے سے پہلے ہی فنا ہو جاؤ

مورِدِ فضل و کرم وارثِ ایمان و ہدیٰ
عاشقِ احمدؐ و محبوبِ خدا ہو جاؤ

عشقِ الٰہی

از حضرت امام جماعت احمدیہ اطال اللہ بقاءہ

بابِ رحمت خود بخود پھر تم پہ وا ہو جائیگا
جب تمہارا قادرِ مطلق خدا ہو جائیگا

دشمنِ جانی جو ہوگا آشنا ہو جائیگا
بوم بھی ہوگا اگر گھر میں ہما ہو جائیگا

جو کہ شمع روئے دلبر پہ فنا ہو جائیگا
خاک بھی ہوگا تو پھر خاک شفا ہو جائیگا

جس کا مسلک زہد و ذکر و اتقا ہو جائیگا
پنجۂ شیطاں سے وہ بالکل رہا ہو جائیگا

دیر کرتے ہیں جو نیکی میں ہے کیا انکا خیال
موت کی ساعت میں بھی کچھ التوا ہو جائیگا

خاک میں ملکر ملیں گے تجھ سے یارب ایک دن
درد جب حد سے بڑھے گا تو دوا ہو جائیگا

ہیں درِ مالک پہ بیٹھے ہم لگائے ٹکٹکی
ہاں کبھی تو اپنا نالہ بھی رسا ہو جائیگا

چھوڑ دو اعمالِ بد کے ساتھ بدصحبت بھی تم
زخم سے انگور مل کر پھر ہرا ہو جائیگا

کیوں نہ گرداب ہلاکت سے نکل آئیگی قوم
کشتیٔ دیں کا خدا جب ناخدا ہو جائیگا

کر لو جو کچھ موت کے آنے سے پہلے ہو سکے
تیر چھٹ کر موت کا کیا پھر خطا ہو جائیگا

عشقِ مولےٰ دل میں جب محمود ہوگا موجزن
یاد کر اس دن کو تو پھر کیا سے کیا ہو جائیگا

فیض احمد اسلم

تعلیمُ الاِسلام کالج

مرکزِ علم اے درس گاہِ تو دی
تُو نے ذرّوں کو خورشیدِ تاباں کیا
تو نے کلیوں کو بخشا ہے ذوقِ نمو
تو نے قطروں کو ہمدوشِ طُوفاں کیا

جب بھی آیا کوئی لے کے قلبِ حزیں
تُو نے اُس کو نئی زندگی بخش دی
کتنے ذہنوں نے پائی ہی تجھ سے جِلا
کتنے چہروں کو تابندگی بخش دی

مَیں بھی نازاں ہُوں تیری ہی آغوش میں
سانس لینے کی مُجھ کو سعادت ملی
میری تخئیل کو مِل گئیں رفعتیں
میرے دِل کو عزائم کی دولت ملی

بارہا گو چلیں ظُلم کی آندھیاں
تیرے رَوشن دِئے کو بُجھا نہ سکیں
تُو ہے وُہ نقشِ باطل کی سَب قُوّتیں
لوحِ ہستی سے جس کو مِٹا نہ سکیں

ہر قدم پر مصائب کا تھا سامنا
ہر مُصیبت سے عُہدہ بَرآ ہو گئے
تُو نے ایسا دِیا درسِ "عِلم و عمل"
جو تھے رہرو وُہی رہنما ہو گئے

مغربی فلسفہ کے جو نخچیر تھے
تیری عظمت کا دَم وُہ بھی بھرنے لگے
آستانے پہ تیرے جو نظریں پڑیں
گردنیں خم عقیدت سے کرنے لگیں

ایک مَردِ مجاہد کی آنکھوں میں جب
عزمِ تعمیرِ نَو مُسکرانے لگا
بن کے شمعِ شبِ تیرہ و تار میں
ارضِ ربوہ پہ تُو جگمگانے لگا

چوہدری محمد علی ایم۔اے

غزل

نعرہ زن بزم میں جب تُو ہوگا
کس کو جذبات پہ قابُو ہوگا

زیست کی کوئی تو صُورت ہوگی
چین کا کوئی تو پہلُو ہوگا

رات بھر سیرِ چراغاں ہوگی
کہیں جُگنو کہیں آنسو ہوگا

ہم چلے جائیں گے اُٹھ کر تنہا
یہ بھی فریاد کا پہلو ہوگا

چاند نکلے گا کہ تم آؤ گے
فیصلہ اِس کا لبِ جُو ہوگا

دم بخود جس سے ہے شہرِ مسحور
وُہ تری آنکھ کا جادُو ہوگا

قیس تنہائی سے ڈرتا کیوں ہے
دشت میں کوئی تو آہُو ہوگا

کس کو حاصل ہے دوام اے ساقی
ہم نہیں ہونگے تو کیا تُو ہوگا

جس نے گروں کو سنبھالا مُضطر
وُہ مرے یار کا بازُو ہوگا

قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل

○

مرے سجدوں کی مستی رقص کرلے آستانے پر
نہ کر پرواہ اگر بجلی گرے گی آشیانے پر

مرے خونناب دل کو رکھو محفوظ آنکھوں میں
اسی سرخی سے لکھنا حاشیہ میرے فسانے پر

ہزاروں بلبلیں ہیں خوش نوا گلزارِ احمد میں
سرورِ سمع ہر کس اب ترانہ ہے ترانے پر

مجھے اپنا بنا کر اپنے ہاں رکھ لیجئے پیارے
رہونگا کب تلک سرگشتگی میں آنے جانے پر

زباں اتنی نہیں کرتے زباں کو روک لے اکمل
زباں کو رکھ دیا جائیگا اے دشمن زبانے پر

شیخ روشن دین تنویر

○

لب پہ تبسم آنکھ میں آنسو
کتنا منافق ہے دردِ دل تُو

مٹی ہی مٹی اگر ہے گلستاں
آئے کہاں سے رنگ اور خوشبو

ایسا ستمگر دیکھا ہے کس نے
بات میں بد خُو ذات میں دلجو

کوئی کبوتر دل کی خبر لے
جب نہیں اپنے آپ پہ قابو

عشق کا میں نے رنگ رچایا
تُو نے جگایا حُسن کا جادو

آنکھ سے پردہ دیکھ ہٹا کر
کون ہیں دونوں تو مَیں ۔ مَیں تو

کھینچے حیا نے تنویر پردے
آنکھ پہ پلکیں پلکوں پہ ابرو

شیخ روشن دین تنویر

من از نسیم و نکہت و نغمہ سبک ترم — آں مرغکم کہ در چمنِ بے فضا پرم

ہمچو خلیل از حدِ محسوس بگزرم — بیگانہ ستارہ و مہتاب و نیّرم

از خیمہ زخویش سازم و بر چرخ چوں حباب — در بحر اگرچہ قطرۂ آبِ تنک برم

پائندہ زندگانیِ من شد ز سوزِ عشق — شعلہ بقائے داد مثالِ سمندرم

بادم مگو حقائقِ فرسودۂ چمن — در دل ہزار لالۂ نوخیز پروَرم

صد دیدہ ہا ز شعلۂ یک دیدہ بر فروخت — از جلوہ بجلوۂ دیگر رہ برم

در پردۂ دبیزِ گل و لالہ بستہ اند — آں منظرِ لطیف کہ بے دیدہ بنگرم

تنویر اگرچہ ہم نشیں ایں نکتہ در نیافت
از خویش رفتہ ام کہ من از خویش برترم

○

تھا مُہر لبِ غنچہ گُل چاک گریباں تھا
اظہارِ غمِ فرقت دونوں سے نمایاں تھا

فرقت میں مری آنکھیں خونبار نہ کیوں ہوتیں
گلزار میں لالہ بھی خود خون بداماں تھا

اے واعظِ فرزانہ الزام نہ دے مجھ کو
تو بھی تو جوانی میں خود ایسا ہی ناداں تھا

قدرت نے ترے ابرو کو تیغ کی صورت دی
پہلے ہی سے گویا یہ مرے قتل کا ساماں تھا

اُس شوخ کے دامن کو کس شوق سے تھا ماتھا
"جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا"

مطرب نے جو محفل میں ارشد کی غزل گائی
ہر رند تعجب سے انگشت بدنداں تھا

ارشد ترمذی
بی اے (آنرز) سال دوم

ایں چنیں نالیم از جورِ بُتِ مغرورِ ما
می چکد از لالہ ہا خونِ دلِ مہجورِ ما

برفرازِ کوہ صنوبر ہر نفس نغمہ سرا
در چمن مست است نرگس از دمِ مخمورِ ما

آں مسیحا چوں مرا تیمارداری می کند
ہر نفس مرضِ دگر جوید دلِ رنجورِ ما

نغمہ ہائے عشق و مستی می سرایند مطربان
می سراید نغمۂ فرقت دلِ مجبورِ ما

واعظا مارا بدام حور و غلماں مبند
ما نمی خواہیم کس را جز بُتِ مغرورِ ما

ما دگر جوئیم راہِ خانۂ پیرِ مغاں
چوں بدامِ زلف می افتد دلِ مہجورِ ما

خالد ہدایت بھٹی

○

خرد کی اُلجھنوں میں دل کو اُلجھاتا رہا ہوں مَیں
عبث بیکار باتیں اُس کو سمجھاتا رہا ہوں مَیں

بڑے رنگین دھوکے میں کٹی ہے زندگی اپنی
وہ اپنا ہی نہ نکلا جس کو اپناتا رہا ہوں مَیں

نگاہوں میں نہیں جچتی گُل و لالہ کی رنگینی
مگر ہائے! انہی سے دل کو بہلاتا رہا ہوں مَیں

کبھی تنہائی میں شب کی کبھی محفل کی گرمی میں
نہ جانے کیسی اُلجھن تھی کہ گھبراتا رہا ہوں مَیں

بھنور میں ڈوب جاؤں تھا یہی کچھ مقدر میں
اگرچہ یار ہا ساحل تک آجاتا رہا ہوں مَیں

ہے ان کی ضد کہ وہ انکار کرتے ہیں محبت کا
اکیلے میں یقیناً یاد انہیں آتا رہا ہوں مَیں

نہ پوچھو کیا من و سلویٰ میسر تھا محبت میں
کہ خوں پیتا فریبِ آرزو کھاتا رہا ہوں مَیں

اگرچہ بارہا ترکِ محبت کی قسم کھائی
قسم کے بعد پھر ہر بار پچھتاتا رہا ہوں مَیں

مصلح الدین احمد رجیکی مرحوم

جب سے تیری نگاہ نہیں ہوتی
دل سے اپنی نباہ نہیں ہوتی

کاش ناصح کو کوئی سمجھائے
رسمِ اُلفت گناہ نہیں ہوتی

میکدہ میکدہ ہی رہتا ہے
یہ زمین خانقاہ نہیں ہوتی

ان کو مشقِ ستم سے کیا روکیں
ہم غریبوں سے آہ نہیں ہوتی

دل کی تسکیں کا پوچھتے کیا ہو
گاہ ہوتی ہے گاہ نہیں ہوتی

کچھ ستم اِس جہاں میں ایسے ہیں
جن کی دنیا گواہ نہیں ہوتی

تیری آہوں کی خیر ہو مصلح
دل کی دنیا تباہ نہیں ہوتی

(تابعین اصحابِ احمد جلد دوم)

نصیر احمد خان نصیر

ابھر رہے ہیں تصور میں پھر وہی خدوخال — رواں ہے پھر اسی منزل کو کاروانِ خیال
شباب و شعر کی رُت گدگدا گئی دل کو — خیالِ یار ہے گویا خرامِ بادِ شمال
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ مہر و ماہ تمام — کسی کے نور کا پرتو کسی کے رخ کا جمال
یہ جستجو کہ جسے ہم حیات کہتے ہیں — ازل اٹھان ہے اسکی ابد ہے اسکا کمال
ہمارا ذوقِ طلب احتیاجِ دیدہ و دل — تمہارا لطف و کرم بندہ پروری پر دال
چمن میں تو گل و بلبل کی داستاں مت چھیڑ — تمام عشق خرابی، تمام حسن زوال
جھٹک کے ناز سے دامن چھڑانیوالے سن — کسی کے شیشۂ دل میں نہ آ گیا ہو بال
جواب یہ ہے کہ اس کا جواب کیا ہوگا — سوال یہ ہے کہ کیوں لب پہ آ گیا ہے سوال
ہجومِ اشک سے بحرِ الم تلاطم خیز — وفورِ غم سے زمینِ دل کی زلزلت زلزال
کبھی کبھی سی تمنا مٹا مٹا سا سراب — یہ کائنات ہے دل کی وہ ہے نظر کا مآل
یہی ہے دنیا میں امن و سلامتی کی روش — کہ کُل جہان سے نیکی کرو اور کنوئیں میں ڈال

دلِ نصیر پہ ٹوٹے ہیں کوہِ غم کیا کیا
یہ سرگزشت ہے اپنی نہ اس میں قیل نہ قال

زرتشت منیر
بی۔ اے (سال دوم)

انسان

خان زمان خان ٹوسٹ پر انڈا اور مکھن لگا کر کھاتے ہوئے اپنے گریجوایٹ صاحبزادے سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ نسیم چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے سیٹی بجا رہا تھا وہ اپنے باپ کی باتوں سے بے پرواہ اپنے دوستوں کی اس پارٹی کا تصور کر رہا تھا جو آج سہ پہر کیفے ٹیریا میں ہونے والی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈیڈی کی باتیں کتنی خشک ہوتی ہیں ان کے دوست بھی کتنے بور ہوتے ہوں گے۔ بس ہر وقت یہی تجارتی سٹہ بازی کی باتیں، امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس اور کارخانے قائم کرنے کے پلان ان کے علاوہ انہیں اور کوئی بات نہیں سوجھتی۔ اس کے ڈیڈی کہہ رہے تھے "کل میں نے یتیم خانہ کو بیس ہزار روپے کا چیک دیا ہے۔ پرسوں میں نے وزیر صنعت کے کہنے پر پچاس ہزار روپے کا عطیہ نادار مریضوں کے علاج کے لئے دیا ہے" اور وہ سوچ رہا تھا کہ ڈیڈی کیسے فضول کام کرتے ہیں بھلا وہ اس قدر روپیہ مجھے دیتے تو میں یونیورسٹی یونین کا انتخاب کبھی نہ ہارتا ——— نہ جانے کتنی دیر اس کے ڈیڈی بولتے رہتے اور وہ سوچتا رہتا لیکن بیرونی گیٹ کی گھنٹی کی آواز نے اس کے تمام تصوراتی محلات مسمار کر دیئے اور ڈیڈی کی خاموشی نے کمرے کی فضا میں ایک عجیب سکون پیدا کر دیا۔

دوسرے لمحے غلیظ کپڑوں میں ملبوس ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا پژمردہ چہرہ الجھے ہوئے بال اور پیشانی کی سلوٹیں حوادث زمانہ کی نشاندہی کر رہے تھے۔ زمان خان نے پہلی نظر میں ہی اپنی بھتیجی کو پہچان لیا۔ لیکن انہوں نے اس کی آمد پر خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ بیزاری اور نفرت کی ایک لہر ان کے چہرے پر سے گزر گئی۔

زرینہ ان کے بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی جس کی ماں اس کی پیدائش سے کچھ عرصہ بعد ہی فوت ہو گئی اور پھر جب زرینہ دس سال کی ہوئی تو اس کے والد اپنی تمام جاگیر اور اپنی بچی زمان خان کے حوالے کر کے دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ زمان خان نے بچی کی پرورش اپنے گھر میں کی اور گزشتہ برس ہی اس کی شادی کارخانے میں کام کرنے والے ایک مفلس اور نادار مزدور سے کر دی۔ بھائی کی وفات کے بعد زمان خان نے اس کی جاگیر بیچ کر راجدھانی میں کوٹھی خرید لی تو یہاں کے رسم و رواج، یہاں کی چہل پہل انہیں راس آ گئی۔ یہ وہ شہر تھا ———

— جہاں کلچر اور آرٹ رقص و سرود کی عریاں محفلوں کا نام تھا۔

— جہاں ریشم کی طرح نرم گھلاوٹ میں گھلی ہوئی

خود غرضی تھی۔

— جہاں ایک دوسرے کی لاش پر کھڑے اپنی گردنیں اونچی کرنے والے انسان دوستی کے علمبردار موجود تھے۔

ان سب باتوں نے ان کی وضعداری کو تراش خراش کر برابر کر دیا۔ آدمی ذہین تھے بازی کے رخ پر کشتی کھیتے تھے کچھ ہی دنوں میں ہشت پہل ہیرے کی طرح چمک اٹھے۔

انہوں نے امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک فرم قائم کر لی۔ ایک اخبار جاری کر دیا۔ ایک اشاعت گھر کے حصہ دار بن گئے۔ ان کی زندگی ایک سنہری جزیرہ تھی جو افق تا افق پھیلے ہوئے تجارتی سمندر میں تیر رہا تھا۔ اس کے اوپر سنہری ابابیلیں اڑ رہی تھیں اور ساحلوں پر آسمان سے باتیں کرتے ہوئے درختوں کی باہیں قوس و قزح کی طرح لچک لچک کر ہزاروں رنگوں کی افشاں چھڑک رہی تھی ——

"سناؤ! زرینہ کیسے آنا ہوا" زماں خاں اپنی مصنوعی باوقار بلند آواز میں بولے۔

"چچا جان جب سے آپ نے میری غریب رحیمو سے شادی کی ہے میں کبھی آپ کے ہاں نہیں آئی اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھی بھلی ہر طرح سے گزر رہی تھی۔ بعض اوقات ایسے دن بھی آئے کہ رحیمو کو اس کی مزدوری نہ ملی۔ تو ہم نے لگاتار تین تین فاقے کئے۔ ہماری زندگی میں سکون، اطمینان اور محبت تھی۔ اس کے علاوہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ ہماری غیرت نے کبھی یہ گوارا نہ کیا کہ ہم زمانے کے مصائب و آلام سے تنگ آ کر کسی کے آگے دستِ سوال دراز کریں۔ لیکن آج ... جھکتے ہوئے زرینہ کے حلق میں یہ الفاظ اٹک گئے اور ایک لمحہ وقفہ کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔

آج میں زندگی کے ہاتھوں مجبور ہو چکی ہوں چچا جان میری غیرت نے آج تک کبھی یہ برداشت نہ کیا کہ میں آپ سے ایک پائی تک بھی مانگوں۔ لیکن آج میں اپنی غیرت کا گلا گھونٹ کر آپ سے اپنے خاوند کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔ رحیمو گزشتہ تین مہینوں سے سخت بیمار ہے۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ ہم اس کے علاج پر خرچ کر چکے ہیں۔ آج ہمارے گھر میں پھوٹی کوڑی تک بھی نہیں۔ یہاں تک کہ روٹی پکانے کے لئے آٹا اور دیئے کا تیل بھی ختم ہیں۔ رحیمو کی حالت تشویشناک ہو چکی ہے اس لئے خدارا مجھے ڈاکٹر کی فیس کے لئے پندرہ روپے عاریتاً دے دیں جو میں آپ کو رحیمو کے صحت یاب ہوتے ہی لوٹا دوں گی۔

زماں خاں نے چائے کا آخری گھونٹ ختم کر کے سگریٹ سلگا لیا اور کش لیتے ہوئے بولے ——

"زرینہ! مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے لیکن کل ہی مجھے ریڈیو کے کارخانے کے سلسلہ میں جرمنی جانا ہے۔ ایک امریکی فرم کو آرڈر دیتے ہوئے پیشگی ادائیگی کرنی ہے۔ پھر تم نے اخبار میں پڑھا ہو گا کہ نادار مریضوں اور یتیم خانے کے لئے میں نے ستر ہزار روپیہ دیا ہے۔ آج عزیزی نسیم یونیورسٹی میں اپنے دوستوں سے ایک شرط ہار گئے ہیں۔ چنانچہ انکی بازی کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ ابھی عزیزی کو دینے ہیں۔ زرینہ! —— ویری ساری —— ابھی گنجائش نہیں۔"

"چچا جان! میں نے آپ سے اپنے خاوند کی زندگی کی بھیک مانگی تھی۔ آپ کو علم ہے کہ میں آپ کے اس بھائی کی بیٹی ہوں جس کی زمینداری بیچ کر آپ نے شان و شوکت کے یہ عظیم محلات تعمیر کر رکھے ہیں۔ آپ کی نام نہاد ہمدردی کس قدر منافقت پر مبنی ہوتی ہے۔ آپ نادار مریضوں کے لئے بیس بیس ہزار کے عطیے دیتے ہیں تاکہ مخلوقِ خدا سے آپ کی نام نہاد ہمدردی کا چرچا ہو تاکہ آپ شہرت حاصل کریں اور عوام الناس کے دلوں میں آپ کی ساکھ بیٹھ جائے لیکن آپ کا ایک غریب رشتہ دار مرض الموت میں کراہ رہا ہوتا ہے اور آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کیونکہ یہاں وزیرِ صحت کے سامنے نمائش مفقود ہوتی ہے۔ یہاں اخباروں میں نام نہیں چھپتا۔ یہاں آپ کو سستی شہرت حاصل نہیں ہوتی۔

آپ ایک فضول پارٹی پر ڈیڑھ سو روپیہ خرچ کر سکتے ہیں لیکن افسوس ایک غریب رشتہ دار کو موت کے ظالم پنجوں سے بچانے کے لئے ایک حقیر رقم عاریۃً نہیں دے سکتے۔

زمان خاں کا چہرہ سرخ تھا وہ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"ڈونٹ بی سلی — ہم نے تمہارا ٹھیکہ نہیں اٹھا رکھا۔ یہی بہت تھا کہ شادی کر دی"—

خان زمان خان شائد ابھی اور کچھ بھی کہتے لیکن زرینہ جا چکی تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے مضمحل قدموں کے ساتھ سوچتی جاتی تھی کہ یہ امیر لوگ کس قدر ظالم اور سنگدل ہوتے ہیں! یہ لوگ ایر کنڈیشنڈ کمروں میں اپنے نرم گدوں پر آرام کی نیند سوتے ہیں اور غریب سردی سے ٹھٹھرتا اور تکلیف سے آہیں بھرتا ہے۔

یہ امیر لوگ قسم قسم کے کھانوں سے بھری ہوئی میز پر براجمان رہتے ہیں لیکن یہ جانتے ہوئے بھی ان کے دلوں میں احساس تک پیدا نہیں ہوتا کہ ان کے بہت سے رشتہ دار ایسے بھی ہیں جو اس دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں کے لئے بھوک سے بے تاب ہیں۔

یہ لوگ اپنے غریب رشتہ داروں کو ستانے کے لئے ان کے سامنے اپنی آسودگی اور خوشحالی کی داستانیں بیان کرتے ہیں تاکہ غریب کا دل توڑیں اور اس کی زندگی بدمزہ کر دیں۔

اس نے ایک ہمسائے سے پندرہ روپے ادھار لے کر ڈاکٹر کو بلایا اس کا خاوند بخار سے پھنک رہا تھا وہ اس کے سرہانے بیٹھ کر سوچ رہی تھی کہ یہ دنیا بہت خود غرض ہے یہاں کسی کو بھی اپنے بھائی کی تکلیف کا احساس نہیں۔ یہاں کوئی بھی کسی پر احسان نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر مریض کی موت کے بعد ان دواؤں کی اجرت بھی غریبوں کی روزی سے نوچ لیتا ہے جو اس کی موت کا باعث ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر کی آمد نے اس کے خیالات منتشر کر دیئے۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگا کر ہدایت کی کہ مریض کی حالت خراب ہونے پر اسے فوراً بلا لیا جائے —

اور وہ چند قدم چلنے کی زحمت کا معاوضہ لے کر چلتا بنا —

رات کی ہیبت ناک تاریکی بڑھتی جارہی تھی بجلی کے قمقمے مضمحل نظر آرہے تھے۔ آسمان پر موٹے موٹے روتے ہوئے ستارے تھے اور دیئے کی مدھم روشنی میں پلٹتے ہوئے رحیمو کا بخار تیز ہو چکا تھا وہ بخار کے جوش کی وجہ سے کراہ رہا تھا۔ سیاہ تاریک بادل آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر چھا رہے تھے۔

زرینہ کی آنتڑیاں بھوک سے کلبلا رہی تھیں کیونکہ آٹا ختم ہونے کی وجہ سے وہ دو دن سے بھوکی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ڈاکٹر کو بلائے تو کیسے بلائے کیونکہ فیس کی ادائیگی کے لئے ان کے پاس کچھ بھی تو نہ تھا۔ وہ سوچتی رہی کہ یہاں کوئی بھی انسان کسی پر احسان نہیں کرتا۔ اس نے تصور میں اس یونانی فلسفی کو دیکھا جو دن کی روشنی میں چراغ لے کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ اور جب اس سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا تلاش کر رہے ہو تو اس نے جواب دیا۔

"انسان کو تلاش کر رہا ہوں"

دیئے کا تیل ختم ہو چکا تھا اور اس کی ٹمٹماتی ہوئی لَے احتجاج کر رہی تھی ۔۔۔ پھر دیئے کی لَے شعلے میں تبدیل ہوئی ۔۔۔ بھڑکی ۔۔۔ اور گل ہو گئی۔ رات تاریک ہو چکی تھی۔ اور اس کی سنسان تاریکی میں مریض کی کراہیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔

— فرائد الادب —

(۱) اَلْاِحْسَانُ يَقْطَعُ اللِّسَانَ ۔
(۲) اَلسِّتْرُ اَمَانَةٌ
(۳) لَيْسَ لِسُلْطَانِ الْعِلْمِ زَوَالٌ
(۴) اَلْكِذْبُ دَاءٌ وَالصِّدْقُ شِفَاءٌ

(مرسلہ محمد انور قریشی)

— (بقیہ اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۴۵) —

فَجَزَاهُ اللّٰهُ عَلٰى نِعَالِهِ ذٰلِكَ وَكَانَ هٰذَا اَثْقَلَ شَيْءٍ فِيْ مِيْزَانِ عَمَلِهِ وَقَالَ عَزَّ وَجَلَّ :

يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا
عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا
مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ
يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا

(الزمر ۵۳)

اَللّٰهُمَّ نَرْجُوْ رَحْمَتَكَ وَفَضْلَكَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ ۔

آیا ہے یار سامنے مستی میں جھوم لیں
ساغر کو چھوڑ کے ذرا محفل میں گھوم لیں
کانٹوں کو جو وہ گل کہیں تو ہم بھی گل کہیں
کانٹوں کو پھول جان کے نوکوں سے چوم لیں

مبارک احمد عابد

حُسْنُ الْقُرْآنِ وَجَمَالُهُ

وَجَاءَ بِقُرْآنٍ مَجِيدٍ مُكَمَّلٍ
مُنِيرٍ تُنَوَّرَ عَالِمًا وَيُنَوِّرُ

كِتَابٌ كَرِيمٌ حَازَ كُلَّ فَضِيلَةٍ
وَيُسْقِي كُؤُوسَ مَعَارِفٍ وَيُوَقِّرُ

وَفِيهِ رَأَيْنَا بَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى
وَفِيهِ وَجَدْنَا مَا يُقِي وَيُبَصِّرُ

طَرِيٌّ طَلَاوَتُهُ وَلَمْ تَخْفَ نُقْطَةٌ
بِمَا صَانَهُ اللّٰهُ الْقَدِيرُ الْمُوَقَّرُ

فَيَا عَجَبًا مِنْ حُسْنِهِ وَجَمَالِهِ
أَرَى أَنَّهُ دُرٌّ وَمِسْكٌ وَعَنْبَرُ

وَإِنَّ سُرُورِي فِي إِدَارَةِ كَأْسِهِ
فَهَلْ فِي النَّدَامَى حَاضِرٌ مَنْ يُكَرِّرُ

وَرَيَّاهُ قَدْ فَاقَ الْحَدَائِقَ كُلَّهَا
نَسِيمُ الصَّبَا مِنْ شَأْنِهِ تَتَحَيَّرُ

لعطاء المجيب الراشد

إِنَّ رَحْمَةَ اللهِ وَاسِعَةٌ

اَلْاِسْلَامُ دِيْنُ الْفِطْرَةِ، يَقُوْلُ اِنَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلٰهٌ وَاحِدٌ لَا شَرِيْكَ لَهٗ. هُوَ وَاحِدٌ فِيْ صِفَاتِهٖ وَذَاتِهٖ. وَهُوَ وَحْدَهٗ يَسْتَحِقُّ اَنْ يُعْبَدَ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ. وَمِنْ رَحْمَتِهٖ تَعَالٰى اَنَّهٗ كُلَّمَا يُخْطِئُ عَبْدٌ مِنْ عِبَادِهٖ اَوْ يَعْثُرُ زَلَّةً لَا يُؤَاخِذُهٗ عَلَى الْفَوْرِ وَلٰكِنْ يَعْفُوْ عَنْهُ وَيَغْفِرُ لَهٗ وَيُمْهِلُهٗ اِلٰى اَجَلٍ كَيْ يُصْلِحَ نَفْسَهٗ وَيَكُوْنَ مِنَ التَّائِبِيْنَ. وَاللهُ يَعْلَمُ اَنَّ عِبَادَهٗ يَمْلِكُوْنَ قُوًى مَحْدُوْدَةً فَيَرْحَمُ عِبَادَهٗ رَحْمَةً شَامِلَةً وَلٰكِنَّ الَّذِيْ يَطْغٰى وَيُصِرُّ عَلٰى مَا يَفْعَلُ فَيُعَاقِبُهُ اللهُ عِقَابًا اَلِيْمًا.

اِنَّ رَحْمَةَ اللهِ وَاسِعَةٌ لَا تَنْفَدُ اَبَدًا. وَلَا نَسْتَطِيْعُ اَنْ نَعْلَمَ كَيْفِيَّةَ تِلْكَ الرَّحْمَةِ وَنِهَايَتَهَا. وَلَوْ غَفَرَ اللهُ ذُنُوْبَ كُلِّ وَاحِدٍ مِنَ الْمُذْنِبِيْنَ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ فَلَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ شَيْئًا مِنْ بَحْرِ رَحْمَتِهِ الَّتِيْ لَا سَاحِلَ لَهٗ. رَحْمَتُهٗ تَعَالٰى مُمْتَدَّةٌ اِلٰى كُلِّ ذَرَّةٍ مِنَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتِ اِلٰى كُلِّ ذِيْ حَيَاةٍ اِنْسَانًا كَانَ اَوْ حَيَوَانًا. وَكُلُّ شَيْءٍ يَتَمَتَّعُ وَيَنَالُ حَظَّهٗ مِنْ رَحْمَتِهٖ دَائِمًا وَاِلَيْهِ يُشِيْرُ قَوْلُهٗ تَعَالٰى فِي الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ

(الاعراف: ١٥٥)

ثُمَّ اَنَّ رَحْمَةَ اللهِ تَعَالٰى تَنْزِلُ عَلٰى عِبَادِهٖ اَجْمَعِيْنَ. يَكْتَسِبُ الرَّجُلُ خَطَأً كَبِيْرًا مَرَّةً بَعْدَ اُخْرٰى ثُمَّ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهٖ لِكَثْرَةِ ذُنُوْبِهٖ. وَلٰكِنَّ اللهَ يَتَوَجَّهُ اِلَيْهِ وَيَتَحَمَّدُهٗ بِرَحْمَتِهٖ وَيُبَشِّرُهٗ بِالْغُفْرَانِ وَالنَّجَاحِ بَعْدَ اَنْ كَانَ قَطَعَ رَجَاءَهٗ وَاَيِسَ وَكَانَ يَشْفِيْ مِنْ نُزُوْلِ الْعَذَابِ عَلَيْهِ كُلَّ سَاعَةٍ وَاللهُ يَتَجَاوَزُ عَنْ كَثِيْرٍ.

وَمِنْ رَحْمَتِهٖ تَعَالٰى اَنَّهٗ يَتَقَبَّلُ كُلَّ عَمَلٍ صَالِحٍ مَهْمَا كَانَ حَقِيْرًا وَهَامِشِيًّا. وَرُوِيَ حِكَايَةً اَنَّ بَغِيَّةً مِنَ الْبَغَايَا سَقَتْ كَلْبًا عَطْشَانَ بَعْدَ اَنْ نَزَعَتِ الْمَاءَ مِنْ بِئْرٍ فِيْ خُفِّهَا. فَغَفَرَ اللهُ لَهَا وَقِيْلَ اِنَّ رَجُلًا صَالِحًا تَرَكَ ذُبَابَةً تَشْرَبُ مِنْ مِدَادِ دَوَاتِهٖ حِيْنَ كَانَ يَكْتُبُ

(انظر ٧٩)

لچودھری رشید احمد جاوید
بی۔اے (آنرز)

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

حِكْمَةُ الْآيَةِ وَالْبَحْثُ الْعِلْمِيُّ عَنْهَا

قَدْ جَاءَ فِي الْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ
"لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ
تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (البقرة)

وَمَعْنَى الْجُزْءِ الْأَوَّلِ مِنَ الْآيَةِ أَنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ حَمْلَ الرَّجُلِ بِدُوْنِ رِضَائِهِ عَلَى الْأُمُوْرِ الدِّيْنِيَّةِ أَيْ عَلَى الْأُمُوْرِ الَّتِيْ مُتَعَلِّقَةٌ بِمَذْهَبِهِ وَاعْتِقَادِهِ بِاللّٰهِ وَبِوُجُوْدِهِ وَصِفَاتِهِ. ثُمَّ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى
"قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ"

وَمُرَادُهُ أَنَّ الْفَرْقَ بَيْنَ الرُّشْدِ وَالْغَيِّ أَجْلٰى وَأَوْضَحُ. إِنَّ الْهِدَايَةَ وَالضَّلَالَ طَرِيْقَانِ وَاضِحَانِ فَمَنْ يَسْلُكُ طَرِيْقَ الْهِدَايَةِ فَقَدْ فَازَ وَأَفْلَحَ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقَ الضَّلَالِ فَقَدْ خَابَ وَهَلَكَ. فَلَا حَاجَةَ لِأَجْلِ ذَالِكَ لِلْإِكْرَاهِ وَوَرَدَ فِيْ آيَةٍ أُخْرٰى
إِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِرًا
وَّإِمَّا كَفُوْرًا ۝ (الدهر)

أَيْ أَنَّ لِلْإِنْسَانِ طَرِيْقَيْنِ أَحَدُهُمَا طَرِيْقُ الشَّاكِرِيْنَ وَالْآخَرُ طَرِيْقُ الْجَاحِدِيْنَ لِنِعَمِ رَبِّهِمْ وَجَاءَ أَيْضًا
"وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ"

أَيْ قَدْ وَضَّحَ اللّٰهُ نَجْدَ الْهِدَايَةِ وَالْفَلَاحِ وَنَجْدَ الضَّلَالِ وَالْهَلَاكِ وَوَهَبَ لِلْإِنْسَانِ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ فَإِنْ لَمْ يَمْشِ الْإِنْسَانُ عَلَى طَرِيْقِ الْهِدَايَةِ وَالنَّجَاةِ بَعْدَ ذَالِكَ الْإِيْضَاحِ فَلَا مَفَرَّ لَهُ مِنْ عُقُوْبَةٍ شَدِيْدِ الْعِقَابِ.

وَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ الْإِنْسَانَ مُخْتَارًا فَيَخْتَارُ مَا يَشَاءُ وَيَعْمَلُ مَا يُرِيْدُ وَنَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ فَلَا يَنْهٰى عَنْ شَيْءٍ وَلَا يَأْمُرُ بِشَيْءٍ إِلَّا وَيَكُوْنُ فِيْ ذَالِكَ حِكَمٌ كَثِيْرَةٌ وَمَصْلِحَةٌ عَظِيْمَةٌ وَتَفْصِيْلُ الْحِكْمَةِ فِي الْآيَةِ كَمَا يَلِيْ:

(١) نَهَى اللّٰهُ عَنِ الْإِكْرَاهِ فِي الدِّيْنِ لِأَنَّ الْإِكْرَاهَ يُبْعِدُ الْإِنْسَانَ مِنَ اللّٰهِ فَافْرِضُوْا أَنَّ رَجُلًا يَقْبَلُ الْإِسْلَامَ خَوْفًا مِنَ الْإِكْرَاهِ. فَلَا يَزَالُ ذَالِكَ الرَّجُلُ يَتَفَكَّرُ فِيْ ذِهْنِهِ أَنَّ الْمُسْلِمِيْنَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ وَأَنَّهُ حُمِلَ عَلٰى قَبُوْلِ الْإِسْلَامِ وَلَيْسَ هُوَ بِرَاضٍ عَنْهُ فَيَظُنُّ

الإسلامُ دينَ إكراهٍ وَ يُنكِرُ عظمةَ شريعتِهِ وَ يميلُ إلى أفكارِ الدهريّين وَرُبّما اشتبهَ عليهِ أمرُ الدِّينِ وَ يأتي يومٌ يقولُ فيهِ أنّ المسلمينَ ليسَ فيهم جدّيّةٌ وَلا تأثيرٌ فهٰهنا يصيرُ الجبرُ يُبطلُ الحقَّ وَيمحقُ الصدقَ

(٢) وَ نهى اللهُ عن الإكراهِ لِأنّهُ يؤثّرُ في جسدِ الإنسانِ وَليسَ هو يعمُّ شرفَ قلبِهِ وروحِهِ وأيُّ فائدةٍ في ذٰلكَ الفتحِ على الجسدِ إذا كانَ القلبُ في داخلِهِ ما يبرحُ يلفظُ ظنَّ السّوءِ حتّى يكونَ الإنسانُ فظًّا غليظًا فلا يكادُ يدخلُ فيهِ شيءٌ حسنٌ يُصلحُهُ وَ يُطهّرُهُ فيكونُ القلبُ خاليًا مِنَ السُّكونِ وَ الاطمئنانِ . فمِن أيِّ طريقٍ يأتي الاطمئنانُ؟ إنّما تحصيلُ الطمأنينةِ بذكرِ اللهِ كما قالَ

أَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد)

وَليسَ مِن سبيلٍ لذكرِ اللهِ في فضاءِ الإكراهِ الّذي يسلبُ الإنسانَ حرّيّةَ ضميرِهِ وَ فكرِهِ فيزيدُ هٰذا عددَ المنافقينَ وَ يكثّرُهم في الدِّينِ فيما يفقهون . وقالَ اللهُ تعالى في المنافقين :

”إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ“

و”هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللهُ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ“

”وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللهُ لَهُمْ“ (المنافقون)

(٣) وَالإكراهُ في الدِّينِ يُشعلُ نارَ الحربِ وَ الفسادِ بينَ المِلَلِ المتفرّقةِ وَ يُنمي العدوانَ وَ العنادَ بينَ المذاهبِ المختلفةِ فكلُّ دينٍ بالمرصادِ ينتظرونَ وقتَ زوالِ القاهرينَ عليهم فإذا وجدَ القومُ المقهورُ عليهمُ الغلبةَ وَ السّلطانَ فيستنقمونَ مِنَ الّذينَ اعتدَوا عليهم بالقهرِ وَ الظُّلمِ وَ الإكراهِ - وإنّما تموتُ وتنطفئُ هٰذهِ الجذوةُ مِنَ النّارِ بالامتثالِ بأمرهِ تعالى :

”لا إكراهَ في الدِّينِ“ وَهٰذا الأصلُ بناءُ التحمّلِ وَالأمنِ وَالعفوِ . وَالصّبرُ وَالاحتمالُ في الأمورِ الدّينيّةِ أحسنُ وَأجملُ فعلًا وَعملًا - فمَن ينكرُ أثرَهما في القلوبِ وَتأثيرَهما في الأرواحِ وَالأذهانِ ؟

(٤) وَنأتي هٰهنا بدليلٍ آخرَ في إبطالِ الإكراهِ في المذهبِ وَهوَ أنّ أثرَ الجبرِ وَالإكراهِ قليلُ المدّةِ وَسريعُ الزّوالِ وَ الدِّينُ يقتضي الاستقلالَ والاستقامةَ فلا فائدةَ لدينٍ في الإكراهِ - وَموجزُ القولِ أنّ الإكراهَ يهدمُ بناءَ الدِّينِ وَأساسَهُ فلا يكونُ الأمنُ في العالمِ وَ الصُّلحُ بينَ المِلَلِ وَالأقوامِ وَالإكراهُ يحملُ النّاسَ على الحربِ ثمّ الفسادِ بينهم فالإكراهُ في الدِّينِ حرامٌ وَلا يجوزُ أبدًا -

AL-MANAR

(ANNUAL NUMBER)

April, May, June,
1962.

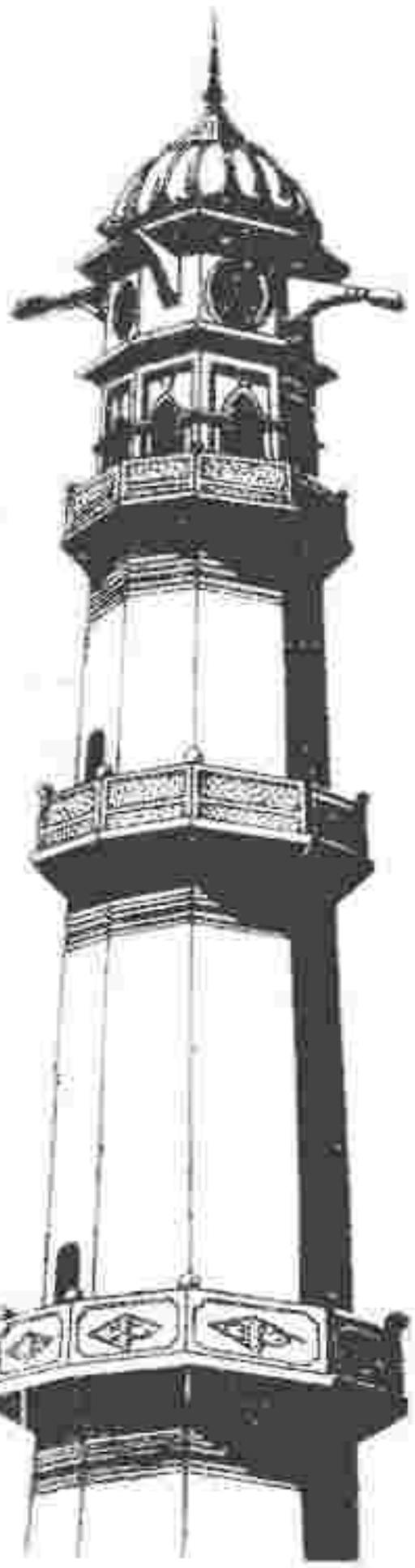

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE
MAGAZINE.

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE
RABWAH

April, May, June
1962

Editors :
IJAZ-UL-HAQ QURESHI
NASEER TAHIR

Contents

			Pages
1.	Editorial.		... 1
2.	Ode on Intimation of God's Supremacy.	*Naseer Tahir.*	... 4
3.	Economic Problems of Pakistan.	*Barkat-ullah Tahir.*	... 5
4.	An Advice to Students.	*Maqbool Malik.*	... 13
5.	Contribution of the Muslims to the Development of Science.	*Hassen Mustun.*	... 17
6	Place of Phy. Edu. In Edu. Programme.	*M. A. Anwar. B.A.,D.P.E.*	... 21
7.	The Hero.	*Ziam-ud-Dean.*	... 25
8.	The Aim of Education.	*Ijaz-ul-Haq.*	... 26
9.	Origin of Life.	*Rasheed Ahmad.*	... 30
10.	Woman.	*A. R. Junaid.*	... 32
11.	Reality of Dreams.	*Saeed Ahmad.*	... 34
12.	The Horns of a Dilemma.	*Naseer Tahir.*	... 37
13.	If I Rest I Rust.	*Mirza Maqbool Ashraf.*	... 39
14	Spring.	*Lal Khan.*	... 41
15.	Titbits.	*Khalil Ahmad (Medical)*	... 42
16.	The Gift.	*Mahmood Sultan.*	... 44
17.	On Getting up Early.	*Muzaffar Awan.*	... 46
18.	The College Clock.	*Ijaz-ul-Haq.*	... 48
19.	Importance of Logic.	*Rana Khalid Rasheed.*	... 50
20.	Trees.	*Khalil Ahmad Nasir.*	... 52
21.	Discover Fiji.	*Ziam-ud-Dean.*	... 53

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE
RABWAH

Vol. XI	April, May, June	No. 5

Editorial

This issue

This Annual Number of our magazine has been brought out with the kind collaboration and co-operation of our friends, and for that matter we are highly thankful to them. As regards its standard and the improvement that we could be able to induce to it, we leave the judgement up to you. We hope that your healthy criticism will be a great help and a guide for our future work.

Examinations

Our annual examinations are now quite at hand and at this time when we are sure that all of you have already devoted yourselves to burning the midnight oil, we need not admonish you any more. Here

in this institution we have got, by the grace of God, a very encouraging atmosphere which does not allow us to divert our attention to any sort of absurdities. It now depends upon our own efforts that we avail ourselves of this golden opportunity or not. However, our personal observation of the graceful scholarly scence in the side-room of our college library augurs well for the results. We pray to the Almighty God that your efforts be crowned with brilliant success and that you may be able to respond to the expectations of your nation and your community in the best manner. Perhaps many of us will not be able to exchange our friendly communications through this magazine. We therefore take this opportunity to bid our most sincere good-bye to all our outgoing friends.

Mr. Anwar Adil's Visit

Mr. Anwar Adil, C. S. P., Education Secretary to the Government of West Pakistan vouchsafed us a kind visit on the 18th of March 1962. He addressed the staff and the students of our college at 10.30 A. M. in the College Hall. We were really fortunate to have such a personality among ourselves ; and will never forget the inspiration that he induced to our souls through his impressive and exhorting address. We hope that our students will do their best to maintain the position that they have achieved in his view. Basically, Mr. Anwar Adil's valuable instructions were a reflection of the sublime Islamic Ideology, which suggests for us a deep self-reformation. What actually is required of us at this critical time is a healthy revolution of ideas. So far we have not been in touch with the virtuous sense of patriotism. But now is the time that we inculcate this sense, and thereby assure the brilliant future of our nation. At this stage of studenthood, it superficially appears to us that we can't be as solid a patriot as the word gives its signinificant expression. But it is wrong to think like that. The student-class of a nation is its most important and vital class. And thus we can well imagine the significance of our sense of loyalty and love to our nation and religion.

It is not necessary that your sense of patriotism finds its expression in your being a political leader or something like that. If you and your society of personal friends are wise enough to keep in mind the sacredness of your Islamic Ideology, your nation, your country

and your graceful green and white flag even in your ordinary every-day life, you will be legitimate in thinking that this small Patriotic Society of your own is rendering a meritorious service to your nation. The fate of a nation is, in fact, in the hands of its individuals. Now that we are the citizens of an independent Islamic country, we should mould our character on such lines as may reinvigorate the grandeur of our remote ancestors who had reached the zenith of achievements in every field. So far as the role of youth the in the sublimity and eminence of Pakistan is concerned, suffice it to say that they are the vital organs required for its rapid progress. If they assimilate good characteristics and give a good account of themselves in the problems of their country it is sure to breathe in the air of prosperity and happiness. So it's the duty of our youth and adults—especially college and university students, that they should never indulge in sowing wild oats and foster such elements as are detrimental to the happy growth of their country. Trials and tribulations may try to impede their way but they should make light of such petty hindrances and make for the goal of success. Our students ought always to avoid worldly allurements and never to commit such things which may degrade the dignity of our country in the eyes of others. On the other hand, if they see any such thing, they should nip it in its very bud lest it should strike roots and corrupt the country. They should always abide by the law and never endeavour to take the law in hand and oust the regulations of the institutions concerned. Now is the time that they should put their feet down and start working for the welfare of their homeland; they should become the embodiment of national progress and push the constructive work vigorously.

Let us not rest on our oars but toil and moil in the cause of our country so that the blood may begin to run afresh in it arteries.

Naseer Tahir

ODE
on Intimation of God's Supremacy

When fears over-awe and hopes dismayed,
I look to Thee and the soul is made;
My Lord, the lovely God !

When left and doomed in the lurch of gloom,
I turn my eyes to Thee, and bloom !
My Lord, the lovely God !

When bumped and downed by the bumptious time,
By You is built my spirit's prime !
My Lord, the lovely God !

When wrecked and torn in the surf of foil
You come to help and crown my toil ;
My Lord, the lovely God !

When prayed and begged, Thy heart is moved,
The sins are pardoned, the might is proved ;
My Lord, the lovely God !

Barkat Ullah Tahir

Economic Problems of Pakistan

When you look around yourself you find that you are not living in a paradise; there being a great deal of poverty, unemployment, inflation and lack of education prevailing in the country. Pakistan's economy, is at a low ebb as our standard of living is low, just as our National Income is low. We have not achieved a favourable and healthy economic position. There is a shortage of goods and services in the country, our rupee stands 50% depreciated in the free markets. The ultimate reason of these defects of our economy is that we do not use our natural and human resources to the optimum level. Moreover we do not properly try to discover 'new resources.'

These are the resources and their properly planned use that make a country rich. As we do not use them properly the result is that our production is low and what we produce is not enough to meet the ever growing demands of the nation. Not only our production is less but the quality of our products is inferior to the products of the more developed countries. The basic principle in these matters is that when a country produces more, she gets more to consume, and her standard of living becomes high and *vice versa*.

Although our country is poor yet there is nothing to worry about. In reality there are huge treasures of God-given riches which are anxious to rush out for our welfare. We can achieve the highest standard of living. But economic progress cannot take place unless the atmosphere is favourable for it. We must have the will to progress; and our economic, legal and political institutions must be favourable for it. No doubt the administrative set up of the govt. plays an important role in the development of a country, but we, the public, are the soul of economic progress of our country and it can only be done if we fully use our physical, mental and moral powers and utilize our resources to the optimum level.

To be more systematic I will

discuss the economic problems of our country and suggest their solutions. Production depends upon four factors i.e., Land, Labour, Capital and Organisation. Because of low production our country is poor. Now I discuss these factors with special reference to Pakistan.

LAND:

The total area of Pakistan is 364, 737 square miles, but all of it is not utilized because part of it is barren, part of it is covered with rocks, deserts, and battle fields reminding us of our glorious past, and part of it is under water-logging and salinity. The remaining is not properly used. In the methods of agriculture itself there are many defects. The equipments and tools used for ploughing are old and out of date. Suitable irrigation facilities are not available. Unhealthy seeds haphazardly thrown are very harmful from economic point of view. The fields are not protected properly and a large amount of crops is wasted. The farmer is innocent and ignorant, rather silly. Besides, there are very little credit facilities available to the farmers due to which land is not properly used.

But I am pleased to mention the active and important part played by the present regime in introducing the excellent 'Land Reforms' due to which the problem of land ownership and fragmentation of holdings has been solved. In these reforms certain very important facilities have been provided to the farmers and our economy has been stabalized to a good extent. But we are not yet self-sufficient in food, still more efforts are needed.

LABOUR :

The second and more important factor i.e., labour consists of the population which comes about more than nine crores (93. 8 million). But the whole of it is not productive labour. People who are either unfit for work, due to physical, mental or moral disability, or who do not wish to work are excluded from the category of productive labour. So unemployable parasites are a huge burden and hindrdance in the way of development of the country. The remaining portion is very small and not only this, even our productive labour is less efficient, less productive and less mobile as compared to other advanced countries of the world. Poverty, ancient customs and traditions, and family ties are also proving barriers in the way of progress. So, the people are poor, density of pupulation per square mile is high in comparison to the availabe re-

sources ; and therefore we have got disease, inadequate medical facilities unhealthy surroundings, lack of recreational facilities and so on, which make our labour physically, mentally and morally less productive. Thus inspite of the fact that more than 75% of our population is engaged in agriculture still there is shortage of food.

CAPITAL :

The third important factor, capital, is in an even more deplorable condition in Pakistan. In the modern age its importance has increased very much, but we are suffering from extreme shortage of capital. There are certain reasons behind it.

First that the other two factors *i.e.*, land and labour are not fully productive. It leads to less production and less production means less national income and low per capita income. When people earn little, they save little. Thus we have a very small saving that may be invested on development schemes.

Secondly, there is a shortage of saving institutions in the country, especially in villages. The major portion of our population is illiterate and does not understand the importance of saving.

So on account of less savings and less investment there is shortage of capital which leads to less production and poverty in the country.

ORGANISATION :

This is the fourth important factor of production. Organiser is the man (or men) who brings together the three above mentioned factors of production and pays them their due rewards. An organiser has to perform three main functions *i.e.*, to initiate a business, to supervise its operation and to take all the risks of the business. If we compare these factors with the body of man, the organisation is just like brain. So from its functions we can judge its importance in the field of production.

Casting a glance over the development of civilisation of the world we realise that it was only when Man had satisfied his hunger that he was able to attend to the thinking or pondering side of life. It means mind works only when stomach works. Similarly organisation is one of thinking, planning and administrating sides of the production Thus when we find that there is a large scale poverty in the country, we will have to admit the negative supply of organisers. I do not mean there are no

organisers whatsoever in the country, I mean to say that there are good organisers present but they are too few in comparison to the great demand for them.

All these defects in our economic system are mainly divided into two branches i.e., unemployment and inflation which lead to poverty. Now I discuss unemployment, inflation and their remedies.

UNEMPLOYMENT:

By unemployment we mean "a state of affairs when in a country there are large numbers of able-bodied persons of working age who are willing to work but cannot find it at current wage-levels".

Invention of machinery has given birth to unemployment. It has been described as "the shadow side of progress".

There are so many people in our country unemployed wandering here and there in search of living.

There are so many causes of this problem that cannot be discussed here in detail. However the main cause is low investment related to shortage of capital. Besides, over-population is another factor.

In reality there are subjective and objective causes of this terrible disease. Subjective causes are due to physical, mental or moral defects of the individuals. And the objective causes spring from the natural forces over which the individual himself has no control as trade-cycles, seasonal demand and supply, industrial changes, the system of causal labour and social time-lag etc. So on account of these causes unemployment exists almost everywhere in the world especially in under-developed countries like Pakistan. But we can control it to a great extent.

INFLATION

In Germany during the Second World War, people used to take with them a bag full of currency notes to the market and returned with an empty bag. This is inflation—less value of money and rising price level.

Although we do not have such a degree of inflation in our country yet the value of money is not up to its original level and the general price level is high. No doubt the present government has reduced the high degree of inflation in the country but inflation is still there.

Whenever there is unemploy-

ment and inflation in a country it is easy for an economist to understand that there is poverty. So these are the reasons that there is shortage of goods and services, low National Income, poor standard of living and depreciation of Pakistani Rupee in the World Market etc.

SOLUTION

The solutions which I am going to put forward are not standard solutions and they need not be necessarily followed. But if they are acted upon, I hope we will be able to achieve our objectives and material needs of the nation to a considerable extent.

Pakistan being an agricultural country, and as agriculture is the main source of subsistence, we should take into consideration our agriculture first.

First of all, the Land Reforms of the government are a 'Real Tonic' to our land problems. The problems of ownership of land and fragmentation of holdings have been solved. The extremely large holdings and extremely small holdings have been abolished. The landlords having thousands of acres and the landlords having only a few 'kanals' have been finished. The problem that still remains is the improvement in the art of cultivation. Here are some suggestions to remove these defects of our agriculture system.

1. First of all up-to-date machinery and the latest implements should be used in agriculture.

2. Our farmers should be provided with chemically tested and developed seeds. They should not simply throw it in the farm as they previously used to throw. Seed is the most important factor for advancement in agriculture, and if it is not healthy and properly used we cannot produe healthy and bumpy crops.

3. The soil of certain parts of the country is unculturable, but it can be improved by better manure and proper attention. Research in this matter should be made by experts.

4. Adequate irrigation facilities should be available to the farmers. The agriculturists should not depend upon rain and primitive broken wells. Canal water is the best solution. And, if possible the canal water should be stored for drought. It may be pumped out by tubewells.

5. For stopping the wastage of crops, plants should be carefully protected from animals, pests, diseases, floods and other emergencies as locust and drought.

6. After the crop is harvested till it is consumed by the people a large quantity of it is wasted away in transportation and primitive methods of storing. This wastage should be avoided through better transport facilities and modern methods of stocking and storing.

7. Then we should attend to our agriculturists. They should be well-trained to handle modern art of agriculture. For this purpose there should be many Agricultural schools to teach and train them in modern techniques of cultivation.

8. The agriculturists should be trained not only in modern techniques but they must be provided with credit facilities for their agricultural needs. To perform this function there should be Agrarian Reform Committees framed by expert farmers to look after their brethren and help them with cash and counsel in evry possible way.

9. There should be Agricultural weeks and festivals to celebrate and infuse interest and progress among the agriculturists. There should be competitions among farmers and those with the best crop of the season should be rewarded by the government through these committees.

10. More and more barren land should be brought under cultivation. This involves risk taking because it is very difficult to carry out a project of cultivating virgin land. There may be no profit in the beginning of such a venture so this method should be adopted for the extention and improvement of the nation's agricultural output. To encourage the agriculturists the government should adopt social policies. Both intensive and extensive cultivation should be made use of.

11. Water-Logging and salinity should be removed and other such diseases of the soil should be cured by the experts.

12. Our agriculturists should be taught and made to understand, that morally it is our duty to increase the agricultural yield not only for every individual of our country but for the other underdeveloped countries of the world.

UNEMPLOYMENT:

Unemployment is an internat-

ional problem and international remedies have been suggested according to the circumstances of different countries. But the best solution of this problem is Economic Planning. The total labour force should be employed in such a way that the Marginal Employment capacity of every plant and factory should be at the optimum and same level. And, the remaining part of the total labour force, should be utilised in surveying and discovering new natural resources for the nation. This division of labour will lead to more production and prosperity throughout the country.

The offices of Employment Exchange should be established so that there may be connection between workers and employers and vacancies should be easily filled as soon as they occur.

Unemployment on account of trade cycles can be finished by spreading the reduced demand for labour over the other effective trades of the country.

Seasonal unemployment can be met by exchanging one seasonal demand with an other. In this way a balance will occur in the different seasonal trades which will lead to more production.

Social insurance is also a good method to tackle with unemployment.

INDUSTRY :

The industrial side of our country is poorer than even agriculture which is only due to shortage of capital and skilled labour. No doubt that P.I.D.C. is playing a very important role in this field but the rate of our progress in this line is very slow, and with this low rate of progress we cannot compete with the other developed countries as Britain and America. And as we know that increase in capital depends upon saving and this saving demands a sacrifice from us. Unless we sacrifice our needs for the sake of the nation we cannot achieve high standard of living. We should make the best use of our abilites. Under the law of nature a time is coming when we people will achieve a high economic position in the world. Remember that we are for the country and the country is for us. Come out with your best efforts and we will progress.

The theme of this whole discussion is that there must be rapid economic progress in our country which is impossible unless the leaders of our country at all levels—politicians, professors teachers,

doctors, business leaders, trade unionists, lawyers, farmers, organisers, preachers, journaalists, students and all others desire economic progress for the country, and are willing to pay its price, which is the creation of a society from which economic political and social selfishness has been eliminated. So we must fully and honestly utillise our natural and human resources to increase the rate of progress of the nation. The whole burden of the nation is on our shoulders and we must step towards the right path to achieve a good standard of living with the available resources of the couutry. And it can be done only by this principle that "country is for us and we are for the country". To raise the standard of living with the available resources of the country two golden rules have been expounded by Dr. S.M. Akhtar a prominant economist of Pakistan.

(i) "All the economic activities should be organised in such a way to utilise the human and natural rescurces of the country to the optimum level so that the largest amount of goods and services may be produced in accordance with the desire of the people."

(ii) "The production of a given period of time should be distributed among the people in such a way as, on the one hand, to make available to them a civilised standard of living, and on the other, to strengthen the foundation of economy for the future increase in production."

When we act upon these golden principles our production will increase and this will increase the number of goods and services both for our consumption and for export. When our exports will increase, we will earn more foreign exchange in the World Market, the value of our currency will increase and we will achieve a healthy economic position.

There are many things more important than money, but you need so much money to have them.

(Marx)

Maqbool Malik

An Advice to Students

While sitting on a chair, I was engaged in writing a thesis on some medical affair, when I was suddenly informed by an attendant of the hospital, that some of my old friends desired to see me. As I was busy in a very serious work, my guests had to wait for half an hour before they could come to me. However I apologized to them for that inconvenience.

I told them that during an operation, recently executed, I had got something relating to my thesis and now I was recording that all.

Our conversation then followed like this.

Aslam : well, dear doctor, I am sometimes actually surprised a lot when I see that you who have got higher education and accomplished much research work in America, don't avail yourself of the opportunity of progress and fame in foreign countries, where scope of earning and luxuries is quite wider than it is in Pakistan.

Naeem : And the same riddle annoys me ! Actually it is very surprising to lose such a chance deliberately.

These remarks were given by two of my friends. I could think of nothing more than that those fellows were actually poor! Though smuggling had made them glittering outwardly, yet they were poor in humanity. However on hearing them say like that, I replied,

> "Is it not great injustice to my country ? Is it not a brutality to neglect my own country only for the sake of money and wealth, and to be ambitious and avaricious? Can a true beloved cheat her lover or a child cheat her mother ? No ! dear, it is inhuman and in that case we had better never been born even".

Then our conversation continued for a few hours and I put it into their minds, that the country

that has served them very well in every field of life i.e., which has provided them with all the necessities of life, their clothes their residence and above all their education, would it be better for them to neglect its great responsibilities they have upon them. For a true patriot it would not be proper to do so. He would like to die rather to be disloyal to his country.

Our self and our wealth and money, and our time are for our country, and not for others. It is because we are raised up to our climax by the maternal care of our country, and we should be ready to lay down our life to save our country and our nation from the slightest thorn on her way. This will be our true affection to our mother land.

All of my friends agreed with me and pledged that they would make the best use of their studies and knowledge, and render their best efforts and services for the betterment of their country, for which they are brought up. I was very happy when I heard their noble desires, and prayed, May God help them to fulfil their noble pledge.

Suddenly I was awakened by Mummy saying, "Maqbool, what is the matter? Are you not feeling well?"

I could not answer her, and was extremely lost in thoughts about the dream. Suddenly the clinking of the clock made me alert. It was going to strike eight o'clock.

"O, today I am too late. Isn't it?" I whispered to my-self.

After a while I left for college. On the way I remained pondering upon the problem pointed out in my dream, and determined to preach the noble idea which I was taught in my dream.

The best that we can do for our country is to become serious in our studies and work hard. If we make ourselves the best that we can, it will be a great service to the country.

I am sure that this noble idea will certainly bring a healthy revolution in themselves and their society. The students who are the pillars of the nation, and who have to be the leaders of tomorrow, have great responsibilities upon their shoulders. It is the time that we take stock of the whole situation

and act accordingly. We should not be influenced by the outward, harmful propaganda, and should not waste our time in trifling affairs and strikes.

The progress of our country largely depends upon us, and if we are honest, sincere and true towards our country, we will certainly come off with flying colours.

Wealth in itself is nothing but a powerless tool. Only the toiling men make their nation powerful and strong by making the best use of their wealth and resources :

"Not gold but only men can make
A nation great and strong,
Men who for truth and honour's sake
Stand fast and suffer long."

Students of our nation have to make much efforts for the social reformation. They have to mould themselves in a noble and glorious character, so that when they possess the key posts of the country, they may influence others by their noble character and by their noble deeds. They should have a burning desire for the progress and prosperity of their country. They should put their heart and soul in their studies, so that when they get power they may be able to prevent corruption, wastefulness, smuggling, black-marketting, and other such fatal diseases of the country with an iron hand. But they can achieve this noble mission only by rendering their services as a true patriot.

This national spirit can only be produced by neglect of self, self sacrifice, disregard of personal pleasures and perviliges. Thus you may be able to serve your country and countrymen with the true sense of patriotism, and you will save your country from degradation and lead to the right path, the path of progress. Your noble life, from the beginning to the end should be a source of freedom for the enslaved people, a source of inspiration for the weak and a torch bearer for the free nations.

Now that the new constitution has been announced, our responsibilities are increased much more than before. Now we have to guide our people to the right path and provide them with the true spirit of the constitution. The grogress and success of this constitution is greatly shared by you as well. You have to inspire a new spirit of patriotism in the public so that they may be able to share equally in all efforts to develop and uplift the country.

Whatever you are, whether poets or statesmen, warriors or artisans, rich or poor, officers or subordinates, all of you should feel intense love for your country and do your best to every possible extent to promote her honour and glory.

So, my humble advice to the students is to be as serious in their studies as possible, so that at the time of discharging their duties, in the broad sense, to the country, they may work with wisdom, courage and faith for the betterment of their nation, and lead their country to the paradise of success and achievement.

When a man gets too old to set a bad example he starts giving good advices. (G.F.C.)

Manners are a sensitive awareness of the feelings of others. If you have that awareness, you have good manners, no matter what fork you use.
(J. P. Harman)

Words are powerful things. (H. G. Wells)

Happiness is the best teacher of good manners; only the unhappy are churlish. (C. Morley)

How beautiful it is to do nothing, and then to rest afterward. (Spanish Proverb)

(Rasheed Ahmad Javed)

Contribution of the Muslims to the Development of Science

In the present age, the West has undoubtedly made remarkable progress in the field of Science, but the term "Dark Age" cannot be properly applied to the East or to the Muslim world; their ancestors have contributed a lot to the development of sciences; they have flooded the world with the light of proper method of finding out the hidden forces of nature and made the man the real master of the Universe. While the people of Western Europe were sunk deep in ignorance and barbarism, Muslim scientists were making important new discoveries in Medicine, Chemistry, Physics and Astronomy. The Muslims led the world to the new field of research and inventions, which basically laid the foundations of what was later on done by the European nations and is termed as the Renaissance.

The Alchemy and the Algebra which are the mother and father of man's knowledge of the modern atomic age, were introduced by the Muslims. In the narrow sense of the word, Alchemy is the pretended art of making gold and silver, or transmitting the base metals in the noble ones, with the help of Philosopher's stone which was believed to be a red powder. Besides, the alchemists also attempted to prepare the 'Elixir of life' which would keep people young and make them live for ever. The credit for some of the best of this alchemical work goes to the famous Arab Muslims of whom some prominent names are Jabir ibn Hayyan, Razi and Abu Ali Seena. They discovered many important chemicals including a number of elements and the three acids which we most commonly use, *i.e.*, Nitric, Sulphuric and Hydrochloric Acids.

Algebra which may be defined as the generalisation and extension of Arithmetic, was invented by an Arab, Mohammad bin Musa al Khwarizimi. In that epoch that branch of Mathematics was known as 'Al-jebr-wal-muqabla.' The Solomon-like rule of the human mind over the universe would not

have been possible without the observation and experiments of the Muslims in the fields of Chemistry and Mathematics which have now split open the atom and given man the tremendous power of dominating over the forces of nature.

The Muslims did not only preserve the sciences of the Greeks but they also wrote commentaries on them and found out their mistakes and re-classified them. For example, Ibne Hateem proved that the rays of light do not come out of the eye but on the other hand they emerge from the object seen.

The West had been under the impression that Roger Bacon, being the originator of the principle of observation and experiment was the father of modern Science but this was wrong. He learnt this from the Muslims of Spain. Robert Bruffalt has clearly proved that Roger Bacon cannot claim to have introduced empericism. He was no more than an intermediary who brought the Muslim sciences and systems of their pursuit of knowledge to the European seats of learning. He always laid stress upon learning the Arabic Language and sciences and asked his contemporaries to go to the Muslims for education as they were the only avenue to the real knowledge and practical sciences and said that there was no other source of learning in the world excepting the Muslims.

In short, the Muslim scientists had unearthed many very important discoveries of the modern science. From the eighth to the twelfth century they were practically the best researchers of all the branches of science and had naturally taken a very prominent part in the scientific researches and inventions. They compiled every nice and useful principle for the further researches in the science of chemistry and prepared wonderful compounds and articles.

Abu Mansur Moowwaffaq found out the correct use of mineralogy and wrote books on the preparation and properties of the minerals, and Abul Qasim put Pharmacology to right uses, learnt and prepared medical elements, compounds and mixtures. Abu Zakaria Razi for the first time compiled scientifically the theories of the nature and properties of the minerals and arranged the chemical elements into various categories. The credit of inventing the gunpowder goes to the Arabs. They purified salt-petre and prepared

gunpowder with it for the first time. The Muslim chemists also discovered Ammonia, the acid of vinegar and other useful pure substances. In the field of Physics Ibne Hateem falsifying the idea of the Greeks clearly proved that light travels from an object seen to the eye and not from the eye to the object. He explained the theory of binocular sight and found out that the refraction of light changes according to the density of the medium. The muslim navigators discovered the method of pointing out the North and South directions by the magnetic needle. According to Sir R. E. Burton, Ibne Majeed was the first to invent the magnetic compass and used it in his voyages.

The discovery of the continent of America was made possible by the magnetic compass invented by the Muslims. The Arab navigators had been using this wonderful instrument centuries before Columbus and thus opened the road for the future development of navigation. Columbus himself admits in his writings that he came to know of the continents of the western hemisphere by going through the work of Ibn-e-Rashid. So it is a clear fact that the credit of discovering America goes partly to Ibne Majeed and Ibne Rashid. Columbus proved the theory of Ibne Rashid to be true.

The Muslim experts in Physics were the real grand-builders of the culture and civilisation of their times. Bani Musa, Khawarazmi, Fargahni and other expert scientists attained the high *pinnacles* of reputation by their achievements in the sphere of knowledge. Fargahni mesaured the diameter of the earth and other planets and the minimum distances between them. Qutbuddin Shirazi, the pupil of Nasiruddin Tusi, three hundred years ago obtained correct results about the explanation of the rainbow and put them down in writing very clearly.

Many strange systems of finding out the time were used in the old times. Some people measured the time by the length of the shadows cast; others used the watches of sand. Some fine sand was put in the upper globe in a period of three hours which was given the name of one "Saat" But the systems were faulty and inconvenient and it was very difficult to measure correct time by them. The correct way of measuring time was discovered during the reign of Fatamide Caliphs of Egypt when the well known Scientist Ibne Yusuf inven-

ted pendulum and the first watch of this world was constructed by Qulbi. The use of watch had become common during the Abbasid period.

The Arabs were also very advanced in the science of Astronomy. The spots of the sun were first discovered by Ibne Rushed. The first observatory of the science of stars was constructed in Serilb of Spain by the Arabs. Abdullah, son of Qutaiba spent his life on the medical plants and wrote about 50 volumes of about 1000 pages each. Another Arab discovered sex in the plant life and proved it on the date plant first of all. Arab notation simplified the Arithmetic by giving the zero and the nine figures to the world. In medicine their independent work was as conspicuous as in alchemy, astronomy and mathematics. The prevalence of eye diseases in the sunny climate of Al-Taraq and other Muslim lands concentrated an early medical attention on this subject. Ibn-Masaqagh wrote the earliest existing text book of Ophthalmology. In the curative use of drugs some remarkable advances were made by the Arabs in the second half of the eleventh century. It was they who established the apothecary shops, founded the earliest school of pharmacy and produced the first pharmacopoeia.

As the Historian's History says, the Muslim Arabs will always deserve thanks for preserving the sciences of the ancient Greeks, as later on the Greeks were quite incapable of keeping alive the spirit of their scientific research, and Europe was so steeped in ignorance that she was quite unfit to shoulder the responsibility of protecting these valuable treasures of the Greek philosophers.

The present stagnation of the Muslims is the cause of their disinheritance of the legacies of their ancestors. As the modern nations are averse to the spirit of Islam, all their scientific achievements have turned into grave danger for the humanity. This very progress would have been put to constructive use if the Muslims had handled it according to the principles laid down by the Holy Quran. But such slogans fall on deaf ears these days.

The Muslims have a living precedent in their forefathers still alive in History.

M. A. Anwar, B.A., D.P.E.

Place of Physical Education in Educational Programme

Under the recommendations of Education Commission the subject of Physical Education has become a compulsory subject to be taught at Intermediate stage of College education. We must know its place and importance in Educational programme and the aims and objectives of Physical Education.

In order to determine the place of Physical Education in Educational programme, we must first review its principles and objectives. These were laid down in 1913 in America as under·

1. Worthy use of leisure.
2. Command of the fundamental processes.
3. Worthy home-membership.
4. Ethical character.
5. Vocation.
6. Citizenship.
7. Health.

Let us examine how Physical Education achieves these objectives. Physical Education contributes to each of the above principles in a large measure, and develops in the people better health, better command of the fundamental processes and gives knowledge and skill which is of great advantage in worthy use of leisure. In games and sports personal desire is subordinated to the good of the group and a person learns how to be a better member of the family and a good citizen of the state. He learns self-discipline and loyalty and to play within the rules and having consideration for others and thereby the ethical character grows in him. Neuro-Muscular co-ordinations and physical fitness makes him better equipped to carry on his vocation.

The objectives of Physical Education.

1. It develops co-ordination of nerves and muscles so that pupils will move and react with ease, grace and precision.

The health of the youth is of prime importance and therefore. the health condition during educa-

tion must be favourable. Activities within the curriculum should be so arranged as to provide for individual differences and maxinum health.

Participation in a large range of Physical Activities is the best known way to develop and maintain health, although it will not itself remove or overcome all physical defects or provide absolute immunities. This programme, however, develops strength, endurance and abundant health necessary for a person to lead a successful and enjoyable life.

Activities in the Phy. Edu. Programme are selected according to the need of the pupils, the community and the facilities available. The programme develops skill and ability to perform these activities. Social, emotional and recreative objectives are highly dependent on the development of skills, because a person must be able to perform well enough to enjoy participation. Conversely, a low level of skill may accentuate emotional difficulty because of disappointment and frustration in participation. Skills can only be developed with the co-ordination of nerves and muscles. If this co-ordination is proper the whole of the body will be developed harmoniously which creates self confindence in the pupil. In this way each person will find and develop some skill or skills to his liking. Pupils are fond of taking part in such things only that they can do well. Therefore, they must be given an opportunity to achieve proficiency in some particular activity.

During the period of growth *i.e.*, upto approximately 20 years of age, one of the vital needs is peysical exercise. Nature has made the maximum physical growth and development dependent upon big muscle activity. Vigorous activity of this type assures the individual of organic strength and adequate muscular development which in turn are of direct help to efficient functioning of mental and emotional processes.

2. It cultivates an interest in games and sports and through them it developes the qualities of sportsman ship and leadership.

3. It developes the qualities of perseverance, resolution and determination through the channel of Physical activities and games.

4. It developes an under-

standing that order and discipline are essential for success in group.

5. It developes the team spirit, which finds its highest expression in patriotism and respect for others.

6. It encourages personal cleanliness and good living as an aid to physical fitness.

Citizenship through Phy. Edu.

Physical Education provides a unique opportunity to put principles of citizenship into actual practice through competitions in games and sports. Behaviour is conditioned through actual practice in proper guidance. Through sports child gains the importance of loyalty, co-operation, team-work, fair-play and self-discipline.

History furnishes us with many good examples of nations which have used physical education to mould the character of its citizens. The kind of a programme and the way it is presented determines in a large measure, the kind of citizens that will be produced by its educational institutions.

Physical Education in Ancient System of Education.

In ancient systems of education, Physical Education occupied a place of pride in the national life. In ancient Greece, 50% of the pupils at school was devoted to Physical Education. Their systems of Education produced some of the greatest intellectuals known in human history such as Socrates, Plato, Aristotle.

Socrates says, "A sound mind in a sound body, is a short but happy description of a happy state in this world, he that has these two has little more to wish for".

Progressive Nations and Physical Education:

In modern times, it may be observed that the nations which are paying more attention to physical Education *e.g.*, the American, the British, the Russians, the Scandinavians and the Japanese are the ones which are leading the world in scientific progress. Their system of education in which Physical Education occupies a prominent place has made these people physically fit and mentally alert and these are, of course, the conditions pre-requisite to national progress. Physical Education of the people occupy a higly important position, so much so that it is fourth in the order of merit in their programme of national development.

Importance of Phy. Edu. in modern Times:

Towards the end of the nineteenth century in some countries tendencies developed to regard Physical Education as a palliative to counteract intensive mental effort, and merely an aid to discipline or a balance to several hours of intellectual training with half an hour or less of physical education every day. But this was effectively checked and since then Physical Education has occupied an important place in the curriculum, and it is commonly accepted that only through muscular activities it is possible to develop the beauty and perfection of the human body. Phy. Edu. is regarded as the sole means to lay a strong foundation of health and physical vigour to fight the impact of modern civilization, to develop a well integrated and balanced personality and to build self-confidences, self-control and courage, the essentials of sound character.

The term Phy. Edu. includes all activities which build up health and physical fitness and help to create a love of open air and healthy way of life *e.g.*, Gymnastics, Athletics, Combative and Recreative sports, Games, swimming and free play camping, Mountaineering etc.

To lose one's health renders science dull, art inglorious strength effortless, wealth useless and eloquence powerless.

(Victor Robinson)

Ziam-ud-Din

THE HERO

"Fire! Fire!" What terrible words to hear when one wakes up in a strange house at the dead of night! It was a large, old, wooden house—the sort that burns beautifully—and my room was on the top floor. I jumped out of bed, opened the door and stepped out into the passage. It was full of thick smoke.

I began to run, but as I was still half-awake, instead of going towards the stairs I went in the opposite direction. The smoke grew thicker and I could see flames all around. The floor became hot under my bare-feet. I found an open door and ran into the room to get to the window. But before I could reach it, one of my feet caught something soft and I fell down. The thing I had fallen over, felt like a bundle of clothes, and I picked it up to protect my face from the smoke and the heat. Just then the floor gave way under me and I crashed into the floor below with pieces of burning wood all around me.

I saw a flaming door-way in fossil, put the bundle over my face and ran. My feet burned terribly, but I got through. As I reached the cool air outside, my bundle of clothes gave a muffled cry. I nearly dropped it in surprise. Then I saw a crowd gathered in the street A woman in a night-dress and a man's borrowed coat screamed as she saw me and came running madly.

"My baby! My baby!" she cried.

The crowed cheered wildly as she took the smoke-blackened bundle out of my arms. I had some difficulty in recognizing her. She was the Mayor's wife, and I had saved her baby. I was a hero!

The Aim of Education

Education means the all-round development of an individual. It includes the progress of human capacities in mental and moral, material and spiritual, social and political fields. It is a social activity in which the individual and the society are equal partners. Education is like a lighthouse on a billowy ocean ; it bestows perennial life on fundamental values of human life and leads man to a distinct, particular and well-defined goal.

Education has played an important role in the growth of humanity from barbarity to civilization. Cast a glance, for instance, over men living in earlier ages. They lived the lives of beasts and human flesh had no value. What was the recipe after all which proved to be the vital spark in metamorphosing their position ? It was education.

Sophists, among Greeks, emphasised on the education of an individual, having strong conviction that it was essential for everyone to have some training for his safety and go on progressing in the group of tribe to which he belonged. They set up a system of education in which every individual might have ample opportunities for happiness and proceed on the road to success.

Socrates held the view that education must create good citizens so that every individual may live with happiness and peace. Plato believed that as every individual has particular capacities, so different duties would be entrusted to different individuals by means of education. Aristotle was of the opinion that education should aim at making the individuals virtuous and chaste.

Fobel, a strong supporter of Rousseau, firmly believed that every child had different capacities and he must be given education according to them. He named the school as 'garden of children'. His view was that a teacher was its gardener while children were its flowers. Just as a gardener looks after the flowers and assists in their growth, similarly, it was the duty of a teacher to educate the children on

such lines that they might nourish properly and make the most of their aptitudes. A child, he believed, was not an isolated individual of a society ; he was an honourable member of society, so it was the duty of teachers and educational authorities to think that a child was an inseparable part of society. Moreover, they should help him in creating indifference with society so that he might nourish his personality in a proper way. To him there could be no nourishment of a child's individuality unless he was related to society and did try to assimilate the moral and spiritual values of society. So Fobel thought that education must enable every child to work for the progress and benefit of his society.

An Education Commission in America has remarked that education must create self-realization in man and it should engender such characteristics in an individual as may enable him to appear sociable and venerable in every society. Allama Iqbal has also emphasised that man should realize himself whether through education or by other means.

Islam has given us a system of education par excellence centuries ago and it fulfils all the aims of education which the modern educationists have come to realize today. Islam taught the lessons of fraternity, equality and the moral sense of right and wrong. It infused such a spirit among the Muslims that they soared up to astounding heights and in a quarter of a century the glory and grandeur of Rome and Persia was held under their sway. Inspite of having the most valuable things at their commands they never discarded Islamic Law under which they have to seek the love of God. So our education must aim at raising the spiritual standard of our masses if we intend to restore the prestige of our ancestors.

At present most of the people think that the education which fulfils the purpose of 'bread and butter' is the real education. This is all-together wrong. It can be assumed a means to an end but not an end in itself. There is no denial the fact that education makes an individual seek his livelihood. But the real aim of education is to gain materialistic as well as spiritual ends. The educational systems in Russia and America make the students well-trained in materialistic pursuits only. Islam does not think in these terms ; it wants us to gain material and spiritual education side by side. So education in Pakistan must aim at developing all aspects of a child

in such a way that he may progress materially and spiritually.

Herbert, the great educationist, is of the opinion that education must teach a child the lessons of morality. Sir Bugley and Dewey emphasised that education must develop the individuality of a child in such a way that after the completion of his studies he may be able to serve his society well. This is, in fact, the real aim to which now we people give the name of "Adjustment aim of Education."

Only that education can be called progressive which can prepare suitable ground for a child to face the upheavals of life ; to face trials and tribulations unhesitatingly and ultimately come off with flying colours after carrying the day in the struggle for existence. The children of today, the youths of tomorrow and the leaders of future must be brought up seriously at this critical moment, for an individual can make or mar the whole nation. So, if education in our institutions serves these purposes, well and good ; but if it does not, let us take it upon ourselves to educate them on these lines.

The Commission on National Education has recommended the following things to fulfil the aims of education :

1 Our Education should be designed to make a child functionally literate.
2. To develop all aspects of his personality, moral, physical and mental.
3. To equip him with the basic knowledge and skill required of an individual and a citizen and prepare him for further education.
4. To arouse a sense of Civic responsibility, love for his country and willingness to contribute to his development.
5. To develop the habit of industry, integrity and curiosity.
6. To awaken a liking for physical activity and sports and games.
7. Secondary Education should bring about the full development of the child (a) as an individual (b) as a citizen (c) as a worker (d) as a patriot to enable him to understand and enjoy the benefits of social progress, scientific discovery and inventions, and to participate in economical useful activities.

The recommendations of the said Commission are really appreciable but they can prove successful only if they are acted upon and not neglected.

Education in Pakistan must show its individuals the path of virtue, have in them faith in God, sense of unity, love for fellow-feeling, sympathy and brotherhood. Our education must moralize the masses of Pakistan and see that they avoid luxuries and evil pursuits which make a nation dwindle, decline and perish away. Our education must inculcate those qualities of good citizenship which stimulate the constructive aspect of the society and the country as well. Our students should take upon themselves to guide the people who are led astray in Western culture, show them the path of virtue, glory and progress to every walk of life. If the work of education is pushed on vigorously on these lines, Pakistan can progress by leaps and bounds, leaving the others far behind.

Deft Definitions :

1. A boss is a man who is early when you are late and late when you are early. *(Floriah)*
2. A 'Pressure Cooker' is a wife who gets dinner under protest. *(Wall Street Journal)*
3. Camel : A horse designed by a Commitee. *(Stein)*
4. DEBT : Something a man gets into when he spends as much as he tells his friends he earns.
   (General features Corporation)
5. Hug : A round about way of expressing affection.
   (Atlas News)
6. Small boy's definition of Wind : Air that's in a hurry.

Khalil Ahmad XII Medical.

Rasheed Ahmad

Origin of Life

Geologists state that our earth separated form the sun two billion years ago by the touch of a star that passed after striking against it hurriedly. It was in the molten form at the time of its separation. It remained in this condition for several million years. It is further stated that there was a very thick layer of clouds between the earth and the sun which, acting as beam proof, did not allow the sun-beams to fall upon earth. Instead it rained over it. The water of rain falling upon the molten earth was immediately converted into steam which rising up, again joined the clouds. This process continued until not only the earth became sufficiently cool, but the excess of water codensed and formed the oceans also. It is these oceans which are regarded as the'cradle of life'.

Now obviously, life could not originate upon earth until it became cool and the conditions favourable to origin of life upon its surface prevailed. There are different theories about the origin of life. But the most appropriately convincing, is like this; - "Life originated from the dead organic matter. But how this transition of dead matter into living matter took place? This exciting question was first answered by a Russian Scientist Oparin who studied the topic in detail. He said that certain organic compounds were already present in the earth. Carbon atoms (which are the essential part of Organic compounds) are outstanding in the chemical elements. They show the property of forming long molecular chains giving rise to extremely complex types of compounds. According to Oparin the water of clouds already mentioned above, fell upon these carbon atoms and found certain complex organic compounds. This process might have taken a very long interval, because of the absence of factors (catalysts) which are helpful in accelerating the chemical action. From the point of view of history of the earth even a hundred million years may be regarded a short interval. Believing this to be true our question is not answered, because these complicated substances are with-

out any trace of life. The "spark of life" is determined not only by the chemical constitution but by the definite organisation of the materials concerned.

Let us then differentiate between the dead organic matter and the living matter before we take up the problem of transition. Take protoplasm for example, out of which all the living-beings are derived, we find that it is a solution of complex organic compounds in water. This protoplasm may also be regarded as a colloidal solution of organic particles which are electrically charged. If we add a salt to it, it does not co-agulate as it occurs in the case of inorganic colloidal solutions. Why? To solve this problem let us examine the structure of a carbon colloidal particle individually. It has the property of attracting water molecules towards itself. So we find it to be surrounded by concentric layers of water-molecules. These water-molecules in the form of membrane are firmly attached to it. The existence of such a water membrane surrounding the colloidal particles of complex carbon compounds adds greatly to the stability of these systems and probably represents the most prominent factor in the structure of living matter.

Now this membrane of water prevents the particle from losing its charge. So if a salt is added no co-agulation will occur. But what will happen if we mix two colloidal solutions whose particles are oppositely charged? When we do so, it is seen that oppositely charged particles attract each other, but at the same time the water covering membrane tends to keep it neutral with the result that semi jelly like liquid is formed. This jelly like liquid is called 'coazervate'. We can perform an experiment based upon this principle. If we mix the colloidal solution of gum arabic and gelatine (the electrical particles of these solutions are oppositly charged), it will be seen that a semi liquid mass the 'Coazervate' in the from of small granules is formed.

Many of the investigators have indicated that this semi-liquid 'coazervate' possesses the same properties as shown by the protoplasm. 'Coazervate' (in addition to other properties has the property of absorbing the surounding substances in the from of their solutions. In this way the 'coazervates' can increase their mass and weight etc. The Russian Scientist Oparin states that the formation of Coazervates from the

(*Continued on page 33*)

A. R. Junaid

WOMAN

(From Bain's "The Digit of Man",)

"In the beginning, when Twashtri came to the creation of woman, he found that he had exhausted his materials in the making of man, and that no solid elements were left. In this dilemma, after profound meditation, he did as follows :

He took the rotundity of the moon, and the curves of creepers, and the clinging of tendrils and the trembling of grass, and the slenderness of the reed, and the bloom of flowers, and the lightness of leaves, and the tapering of the elephant's trunk, and the glances of deer, and the clustering of rows of bees, and the joyous gaiety of sunbeams, and the weeping of clouds, and the fickleness of the winds, and the timidity of the hare, and the vanity of the peacock, and the softness of the parrot's bosom, and the hardness of adamant, and the sweetness of honey, and the cruelty of the tiger, and the warm glow of fire, and the coldness of snow, and the chattering of jays, and the cooing of the *Kokila*, and the hypocrisy of the crane, and the fidelity of the *Chakrowaka*, and compounding all these together, he made woman and gave her to man. But, after one week, man came to him and said : 'Lord, this creature that you have given me makes my life miserable. She chatters incessantly and teases me beyond endurance, never leaving me alone ; and she requires incessant attention, and takes all my time up, and cries about nothing, and is always idle ; and so I have come to give her back again, as I cannot live with her. So Twashtri said : Very well ; and he took her back. Then after another week, man came again to him and said : 'Lord, I find that my life is very lonely, since I gave you back that creature. I remember how she used to dance and sing to me, and look at me out of the corner of her eye, and play with me, and cling to me ; and her laughter was music, and she was beautiful to look at, and soft to touch ; so give her back to me again.' So Twashtri said : 'Very well' ; and gave her back again. Then after only three days, man came back to him again and said : 'Lord, I know not how it is, but

after all I have come to the conclusion that she is more of a trouble than a pleasure to me ; so please take her back again. But Twashtri said : 'Out on you ! Be off ! I will have no more of this. You must manage how you can'. Then man said : But I cannot live with her.' And Twashtri replied : 'Neither could you live without her.' And he turned his back on man, and went on with his work : Then man said : 'What is to be done? For I cannot live either with her or without her."

But she was there and there she remained ; and ever since man made the best of it, more or less.

(*Continued from page 31*)

various organic matters dissolved in water of the primeval ocean represents the most important step towards the the development of life upon our planet. One may regard these minute droplets, formed by the ordinay physico-chemical process, as already possessing the property to grow.

From the above discussion we arrive at the conclusion that the stage of evolution of organic matter ceased to be a process uniformly distributed throughout the ocean a life of its own by absorbing substaces as much in quantity as possible. Thus, the individuality of life resulting from the separation of such droplets from one, more or less continuous solution and its mixing with another lead to the "struggle for life", & Darwin's process of the "survival of the fittest".

When it comes to spreading gossip the female of the species is much faster than the male.

Saeed Ahmad

REALITY OF DREAMS

Scientists are dreaming of the day when people will be able to control their dreams with pills. They are hunting for chemicals which, if administered before bedtime, will have the power of preventing nightmares and creating pleasant, entertaining dreams instead. Is it a fantasy? Up to now, yes; but remarkable discoveries are being made in the mysterious world of dreams. The fact is that scientists, pioneering in a series of astonishing experiments, have actually invaded Dreamland at last and emerged with exciting new discoveries.

Investigators at a medical centre, for example, have learned that some people who dream a great deal, actually look forward to sleep with same eager anticipation as going to the theatre.

Persons who are utterly convinced that they never dream, are wrong. They do, but don't remember. Even complicated dreams lasting more than half an hour are forgotten on waking.

And (good news for insomniacs!) those who swear they lie sleepless are often not only slumbering peacefully but dreaming as well.

Here are some of the questions now being answered by research studies in the Land of Dreams:

Can you tell if a sleeping person is dreaming?

Take a long, careful look at the sleeper's eyes. If you can see the eyeballs move beneath the lids he's having a dream. His eyes move because he is actually following a story being unfolded before him. When the eyes are still, the dream is over.

Do men and women dream differently?

They do. Dr. Calvin S. Hall of W. R. University collected the dreams of 400 young men and women and learned that the sexes have different 'opponents' in dreamland. The girls had more quarrels with members of their own families, while the boys

scrapped more with friends or strangers. One interesting conclusion that can be drawn here is that there is not much doubt in a man's mind as to who is friend and who is enemy, but a woman never knows.

When do your nightmares occur?

Dr. Bernared L. Pacella reported at a meeting of the American Psychoanalytic Association that nightmares never occur in deep sleep but in lighter slumber. Generally, they come during the first going-to-sleep period, and for a strange reason. To the unconscious mind sleep is the same as death. Fear of this "Psychologic death" is one of the factors that bring on night terrors.

Can you dream in colour?

Dr. Pacella found that only one person in twenty has this strange experience. Those who do, moreover, have colour dreams only for a while. Curiously, men rarely report rainbow dreaming.

Do blind persons "see" in dreams?

If at one time within his memory a blind person had normal sight, he generally continues to have visual dreams, reports Charles G. Ritter of the American Foundation for the Blind. But the dreams of persons born sightless contain no "sight" at all. They involve sensations of hearing, touch, sound, smell and motion.

Can dreams foretell the future?

Dr. J. Eisenbud, a Denver Colorado, offers new examples to show that people in dreams have often amazing experiences which cannot be definitely explained. In a report published in a scientific journal, he tells this incredible story:

A patient dreamed his mother-in-law who tried to warn him not to go for swimming. He did not heed to the warning and found himself dressed in bathing trunks and a robe in the lobby of a New York hotel which he called the Wellington. He marched through the lobby and entered an elevator which took him to a top floor. Suddenly he felt extremely nervous about being felt alone up there.

At this point he awoke. It was 7. 30 A.M.

An hour later, a drum of cleaning fluid exploded in an elevator of the Wellington Hotel in N. Y. It happened on the top floor. The blast burst a water main and cascades of water flooded the lobby, which soon resembled a giant swimming pool. All this was described the following day

in 'The New York Times'. Consider the facts: A man, determines to go swimming, finds himself in bathing attire in a hotel, and names too, Neither has a pool but soon one of the hotel gets a pool in the form of a flood. In his dream, the man is taken to a top floor where he experiences intense nervousness. Shortly, a blast wrecks havoc on that floor.

There is an even more fantastic aspect to the story. On the evening before the dream Dr. Eisenbud performed an experiment in clairvoyance with another patient. A clairvoyance is supposed to have unique power to see things concealed from every one else while under hypnostic-trance Dr. Eisnbud placed this man in a hypnotic trance and asked him to read the headlines of "The New York Times" two days hence. The subject tried but failed.

But incredibly, the other patient who knew nothing of the clairvoyance test had gone home that night and apparently fulfilled the task. As far as the hotel story was concerned he 'read' "The Times" headlines two days in advance.

The doctors were curious about another thing: what effect, if any, do internal factors have? They conducted this interesting test: On five separate occasions, three subjects were told to drink nothing for 24 hours. Several went to bed so thirsty that they could hardly swallow. Only five appeared related to thirst. One sleeper reported: "I started to heat a great big can or skillet of milk-put almost a quart of milk in..." Another said just as he woke, "Somebody raised a glass for a toast. But I do not think I had a glass" A third reported to have seen a television commercial with a cartoon used in a popular bear ad.

Many psycho-analy sits believe that dreams have deep hidden meaning which, interpretted correctly, give clues to a patient's real needs and desires.

Does it sound like 'Science fiction'?

Penicillin, blood, bone and eye banks, and heart surgery were also fantasies not too many years ago. The explorations are by no means over. Now that doctotrs hold the passport to Dreamland, who knows what new wonders they will find there?

An investigator once said:

(Continued on page 40)

Naseer Tahir

The Horns of A Dilemma

"Unpolished shoes, dirty clothes, untidy hair, what is this all ? Have you lost your senses, boy ?", pointed out my Dad as he saw me hurrying towards my study room with a bundle of books. I stopped and gazed for a while. Then suddenly three horrible words that my Dad could not understand "Eve of Examination", slipped out of my dried lips. In that utter confusion I rushed to my room to secure some ease for my nerves. But perhaps the store of ease had already been spent up levishly in luxuries throughout the year, and now, when the annual examination is quite at hand, it is dis-ease only left for me, encumbering me like a disease for which there appears to exist no doctor to have any cure at all. The devilish room which I so often used to decorate with flowers and papers and goodness knows what else, in my leisurely hours, now cruelly horrified me. It appeared as if no civilization had touched it so far. Everything was at sixes and sevens, as if there were anarchy prevailed in that empire. Some books on the floor, others on the couch and some others sending their torn pages to the corners of the room as if seeds were being dispersed for wide-spread germination of a tree to avoid interspecific competition for survival. This dreadful sight of utter upset added to my confusion and now I was quite at a loss to understand what to do and what not. Presently, I recollected the phrase 'to be on the horns of a dilemma' which was perhaps first used by an irregular student of my own sort, who might have experienced these horns on the eve of an examination. Whenever I came across this phrase in the class of English grammer, I never thought it worthwhile to take pains to understand what it meant. But at present I feel that my experience has taught me the essential meaning of this phrase, so wisely constructed and so helplessly being experienced even now.

However, now when I am on these horns, I have to think how to avoid them in future. Just a few days, ago, I actually surveyed this struggle with these heavy

odds, in a manner somewhat similar to that adopted by historians while surveying the battle of Waterloo or that of Panipat. Considering the events that led to the battle with the horns of a dilemma, I found my own idleness and irregularity to be the main cause.

Usually our enemies come over us when we are without our resources of protection and defence. Our foes will attack us when we have left all our weapons behind. And it was the same what happened here in this battle. My resources such as Books, Studies and Toil, all of them I had kept at an arm's length. And when my enemies, the army of the horns of dilemma, fears of failure, agony of mind, despondency and despair approached me and ordered me," "Hands up", I could get no moment to take up my weapons, which you know, were merely at an arm's length and not very far. I am one of those foolish students, I won't say unfortunate or unlucky, who don't care for their weapons when they should and when they do, it is too late to mend. For my weapons I never cared whether they rust or get perished. But books and knowledge, as they are the perpetual treasures, will never rust out. It is our own idle and passive minds that are affected by rust and destroyed. The same is now my punishment, for I have never been serious about my studies. They say that actions and reactions are equal and opposite ; and that is what I find now. So far I have been resting and over-resting and thus wasting the precious time that was for study. But now, the reaction is dominant and I am rusting and repenting for my sluggishness. Besides my own fault of carelessness, I found no other cause of the battle, and then I proceeded to analyse the mode of the battle and its events. In that concern, I was actually rendered dumb, for I found, and still find, that the capital of my dominion was horribly annihilated. The horns of the dilemma had blocked all the sources that could reinforce the capital city known as Brain. The Post and Telegraph office was thrown out of gear throughout the country and the whole Nervous System was destroyed. And of course, that encounter with Dad was also an important event.

As regards the results of the battle, it is sure that I have to face defeat and frustration. Let us wait for that till the annual examination reveals it itself and gives the devil horns their credit of triumph.

(*Continued on page 41*)

Mirza Maqbool Ashraf

IF I REST I RUST

'We are not here to play, to dream, to drift.

We have hard work to do, and loads to lift.

What is this life? A struggle or a dream? It is of course not a preposterous dream, but a reality, a struggle that we have to participate seriously. It has been a conception for long that life is a stage and we are the players of this stage. We must be active, for in action lies our life. Our inmost-self is dead if it does not urge us to spring forward and to discharge our responsibilities with a smiling face. God has given us 'living limbs' to act, and so we should be in action. If we don't invest our energy and power to the benefit of our fellow human-being, our energies will rust out and our powers subside. So the significance of life is in action and not in our idle disposition to rest. There must be an inner urge of wisdom that we should be ahead in the bivouac of life.

You see how a flower withers when its relation is cut off a plant. So and so, if we cut ourselves off the struggle of life, our faculties and all the providential gifts that we have in our personality will lose their essence; and we must avoid this sad eventuality of our sluggishness. We must know what is going on around us. We must weigh the surrounding situation and then act with a zeal in response to our environment. If we lie in the lap of ignorance, what can we do for our survival? This struggle for existance demands a great deal of toil and labour; and we must prove ourselves to be the fittest for survival. Without this zeal, we will be nourishing our dead body which knows no reality and which has no reality of its own.

It is better if we don't discriminate between the rich and the poor on material basis. A man who handles his job adriotly and dexteriously is actually a man to be called as rich. He is rich, not in frivolity of material wealth, but in the reality of skill and spirit. Just consider your own self. What ever virtues you

possess if you don't utilize them properly, they will lose their influence and power. And of course, the proper use of talents is possible when we are active. If we are so foolish as to remain idle, our talents will fade away, and thus actually if we rest, we rust.

Just see how the great men of this world came to have their dignity and grandeur. They are now our pioneers in the struggle of life; and if we follow them, we can also do the same service to the coming generations. Our holy prophet Hazrat Mohammad (Peace and blessings of God be upon him), our Quid-e-Azam and all others who are great among us, all of them were the men of action. Let us follow their footprints and engender the virtues of toil and moil, self-abnegation, and perseverance, and be wise and bold to take our part in the struggle of life cheerfully. If we don't do this our name and our spirit will perish even before our protoplasm dies. And the sad consequence of our indulging in rest and being idle will be that no one will remember us and we will rust out altogether.

So if we want to succeed in our sublime aims, we should not think of rest but should take the courage to toil and moil.

The heights of great men reached and kept,
Were not attained by sudden flight;
But they, while their companions slept,
Were toiling upward in the night.

(Longfellow).

(*Continued from page 36*)

"Perhaps some day we may be able to have 'creative dreaming.' To understand it, suppose you have an important problem to solve for the next day's business, but it's very late and you are tired. You undress and get into bed. Before falling a sleep, however you present the problem to your subconscious mind, which wrestles with it as you slumber. When you awake in the morning your problem is solved!

The fantasy of today may be a fact tomorrow.

Lal Khan

SPRING

In a garden with the lofty trees,
With green prevailing everywhere ;
Greeted by the fragrant breeze,
I found myself roaming there.

The King of East, the Golden Coach,
Drove dutifully on the usual path ;
Blooming by the morn approach,
The blossoms had a violet bath.

All at once I saw a butterfly,
With multi-coloured beautiful wings ;
To me like a fairy did it fly,
And spoke to me as Bulbul sings :

"The breeze does caress the flowers,
And joyfully lovely ones do flutter ;
How happy are these hours !
Glad and fresh the birds do twitter.

'Springing is everything in view,
Flowers, plants, the green and trees ;
Have started all a life anew,
'Cause now no cold will make them freeze

(*Continued from page 38*)

But that is not all, for history is always a guide and a pioneer itself. The politicians derive instructions from the history of the Past, and so should the students. I have recorded my sad history. It is the story of a student who was idle and foolish, who was passive and crank, and who was unaware of his job and his duty. But all the same, it is an advice to you, my dear. Don't be so foolish and sluggish as to commit these blunders that have led me to the hell of failures and havocs. Be wise in your work and serious to your studies, otherwise the cruel horns of the dilemma will harass you.

TITBITS

For a camera man's birthday his wife decided to present him with 50 flash bulbs. She knew little about cameras, so before wrapping them in gold paper, she carefully tested each bull in the camera. she was delighted that every bulb "worked", and happily presented them to her husband-who still hadn't the heart to tell her the facts about cameras.

To be a woman is something so strange, so confused, so complicated, that only a woman could put up with it. (*Soren*)

A report shows that an 85 year-old Physician has delivered 3,700 babies in the same town over 59-year period. The town's present population is 700.

A question in a test given to a group of science students, asked, "what are the last teeth to appear in the mouth?"

One student's answer was; "False."

The third grade teacher instructed her class to write a sentence beginning with the word 'than'. Most of the students sat quiet and motionless, but one student wrote, "Than is a word with four letters."

Victim: "Hey! That wasn't the tooth I wanted pulled.

Dentist, "Calm yourself. I am coming to it".

"What did you operate on Johnes for."

"One hundred pounds."

"No, no, don't understand," I mean, what did he have."

"One hundred pounds."

The doctor was just leaving the patient who was critically ill. "I will see you in the morning," he said cheerfully.

"I dont doubt that," answered the patient,
"but shall I see you?".

From a general store a man bought a cigar which he proceeded to light. The salesman said, "Smoking is not allowed here." "What," the man exploded, ,'You sell cigars here, and don't allow smoking!"

The salesman looked at him and said,
"We also sell bath towels."

A Texas multimillionaire oilman was touring the world in his private jet plane.

"That's London just below," his pilot said.
"Never mind the details", snapped the Texan,
"Just mention the continents."

Upon his father's return home from a meeting, a fond son asked, "How was your talk tonight ?".

"Which one", he retorted, "the one I was going to give, the one I did give, or the one I delivered so brilliantly to myself on the way home in the car."

The stewardess was talking to a passenger on the train, "I dont't know how it happened, "she said, "but we seem to have left your wife behind in Chicago."

"Thanks", said the husband, "I thought I had gone deaf."

(*Continued from page 49*)

every day. But as ill luck would have it, the bell did not ring even after the lapse of 45 minutes. At length, we lost our patience and sent one of us to see what had happened to the clock. There he found it standing still and re-wound it after setting it right. Then the bell rang and we thanked our stars.

In short, Mr. Clock has interesting and charming characteristics. It is the inevitable part of the college which can never afford to run properly with it. May it live long.

Mahmood Sultan

THE GIFT

A boy was walking in a busy street of the city. One could easily see that he was not very well off. because though his appearance and clothes were neat and tidy, they were sewn at many places. His father was a clerk in an office and though he toiled hard from morn till night he earned hardly enough to feed and support his wife and the only son.

The boy's face was beaming with delight. There was some hidden pleasure in it. It seemed as if he was going on some happy errand. He was walking about cheerfully and almost seemed to fly about as gay as a new born sparrow. He was gazing intently at all the toy's and General Merchant's shops which he passed.

The fact was that he had a very dear friend who was also quite rich. This friend had helped him many times by giving him gifts and all sorts of things. Now it was his birthday and this boy wanted to give him a splendid gift ; a gift that was just fit to be carried by his dear friend. For months he had saved hard. In fact he had'nt spent a single cent on himself at all because he did'nt want to disappoint his friend and wanted to give him such a gift that he would treasure it highly and always remember him because of it and think of him with kind and sweet memories.

Now he had reached the heart of the toy market of the city. There were toy shops on either side of the street. He entered every shop, looked at all the things which were there very carefully and then with a cry of disappointment turned away. Nothing that seemed worthy to be possessed by his friend could be seen. His friend already possessed most of the things which were in the shop. Now the boy's face was showing a tinge of worry also. The time was swiftly fleeing and still he hadn't bought any gift for his friend ; a gift worth twenty five rupees because it was this amount which he had been able to save after months of saving.

Now he had almost reached the end of the market. Only one shop remained. It was quite a big shop. The boy entered it with mixed feelings. 'Would I get the desired gift from the shop?' The question was burning in his mind. He reached all the shelves but still he couldn't find any suitable gift. His heart was filled with bitter disappointment. He turned around to go back when his eyes came across a beautiful platinum chain of a watch. On it was carved the letter 'M', the first letter of his friend's name. Besides it was a pair of gold cuffs. On it also the letter 'M' was carved. The boy almost jumped with delight. Here at last was something which would certainly please his dear friend. Coming on the counter he asked the dealer the price of those things. The dealer made a bill of fifteen rupees and wrapped the gift in a beautiful golden paper. The boy on seeing the bill almost burst out that he had wanted a gift of Rs. twenty five. The dealer was a very tricky fellow. He took a step or two backwards, winked at his assistants and tearing the old bill apart made a new bill, this time for Rs. twenty five. The boy hurriedly paid the due amount and grasping the gift in his hand hurried towards the bus stop because his friend's house was quite far and he had hardly enough time to reach him. After some time the bus came and he took a seat in it. Now once again his face was looking gay and joyful. At last he had found a worthy gift for his friend. When his destination arrived he descended from the bus and went towards his friend's house.

The bus continued on its route. At the next stop a man took a seat in it and sat on the same seat on which the boy had previously been sitting. He saw, what had escaped every one else's notice, a piece of golden paper lying on the farther corner of the seat. He picked it up and on opening the package saw a platnium watch chain and a pair of golden cuffs and also a piece of paper on which was written, "Dear M. I hope that you will accept this gift.....".

Muzaffar Awan

On Getting up Early

"Early to bed and early to rise makes a man healthy, wealthy and wise". This saying must be attributed to the past ages who have seen their youngs wasting their time till late at nights. Those were the dark nights. They enjoyed lesser facilities regarding electricity etc., than us. This saying held good in those days, because in dark nights any kind of activity could not be carried on. Therefore it was the sanest possible advice for those people. But now the time has changed. We have as the poet would call it a flood of light. Our cities, at least, are illuminated for whole of the night. Same is the case with houses. Every house is almost electrified. We do not exercise such difficulties as the people of the past used to do. Now a days, our litrary men, students go on with their work till mid night. Students prepare for their examinations at nights and similarly literary people finish their works. Therefore, the saying might be true in the past but it is not true today. Inspite of it, a part of the saying holds good. Early to bed, we may fiind it impossible but early to rise has many advantages even today.

The chief advantage that an early riser enjoys is that he can prepare himself for his day long activities. As the time is very short, before we start our work, the habit of early rising is very useful. One is not in hurry as he has a lot of time at his disposal, he can dress himself neatly, have his breakfast and over all goes to his work cool-mindedly.

Secondly the early riser can have long walks in the morning. The morning walk is admittedly advantageous. Its effects on our body, vigour, intellect and thinking power can not be denied. It makes fresh our senses. Our brain enlarges and works vigorously when we return home. While going out side one comes across beautiful and appealing objects of nature. It gives birth to a virtuous quality called appreciation of the wonderful things of the universe. Hence it gives birth to art and philosophy. The question

can be put whether such a little walk can impart anything worthy to be appreciated? The answer is "Yes", only for a mind who undertakes walk keeping in view all its advantages. Here walking is as bad as wandering.

The third advantage for an early riser is that as he gets early he can carry on his work earlier than others and finishes it earlier. In this way, if he is a good Govt. employee, can save himself from the rebuke of his boss. It helps in his progress. Again, the habit of early rising is contrary to laziness and lathargy. One keeps himself active and ultimately he can finish his work more carefully and neatly.

Another advantage that can be quoted in support of this contention is that the early riser can plan out all his programme. He writes it on the paper and keeps it in the pocket and he starts his journey. From the very beginning to the last he remains faithful to his programme. Having finished his routine work he enjoys all the modern recreations which the present civilisation has placed at his disposal. He plays in the evening and meets his fellow beings and exchanges conversations with them, goes to radio, has delightful songs and news, all these things go along in the development of his powers. His knowledge is enlarged wonderfully. And his dormant qualities come into play and his moral virtues are vigorously enhanced. Hence he can become a useful member of the society and his contribution to the society may be laudible and praise-worthy.

But the fact remains that who will venture to rise early in the morning as it is a very difficult task? Bed in the morning is no less than the blessing of heaven. Its warmth, politeness and the comforts which a man enjoys are hinderances in the way of riser. One who leaves his composed bed is realy a brave man. He can bear the on-slaughts of sleep which are in fact more powerful than man. So early rising inculcates in us laudible quality and enables us to face critical times. If we are so much delicate and tender then we have no right to be called a man.

So for as the advantages of early rising are concerned they are numerous and their effects cannot easily be denied. So we must develop the habit of rising early in the morning.

Ijaz-ul-Haq

The College Clock

Whenever you enter the college office, the first thing that attracts your attention is the grandfather clock hanging against the wall on your left. Its grey dial has two magnificient black hands, a long hand and a short hand. The figures on its face remind us of Roman Scripture rather difficult for layman to read.

To an ordinary observer Mr. clock may seem to be dull and drab but what do such things matter, for physical beauty is but skin deep. It has faithfully served the collegians for ages: so its days are numbered, they must be mellower and sympathetic towards it. It looks picturesque because it reminds us of the days gone by. In the prime of its youth, it must have been extraordinarily beautiful but now, due to advancing years, the flowers have withered on its face and wrinkles of decriptitude are becoming more and more distinct. The assiduous work in past has put a lot of strain on its nerves and has told upon its health which has fallen gradually.

Let no body think that Mr. Clock is fed up with the hard realities of life. It is still fairly active and goes on pushing the work vigorously. It is living bearing in mind that 'as long as there is life, there is hope', so why to show cowardice? It's the symbol of ideal perseverance and examplary valour.

But, nevertheless, languishness does prevail over it now and then; and it cannot keep pace with its other comrades. Usually it is slow by five minutes, not very amazing as compared with its age. But when its health breaks down awfully, it has to give up all its works and heaves a sigh of relief. It might be scolding man who exploits too much work out of it and doesn't allow it time even to stand and stare. Well, when Mr. Clock falls ill, it needs some doctor to come, feel its pulse and give it some medicine which may enable it recover and start working afresh. In such serious cases, 'Shadi'—its so-called veternary surgeon—calls upon it and winds it up. In this way, you see,

the grandfather clock is made to work for some more days.

Generally, Mr. Clock is held in high esteem by the students. Why, it gives them so much relief. But for its slow movement, they would have missed the first period. They set out in a tearing hurry for college at 8 O'clock and think that by the time they reach the college, the first period would have gone. But thanks to Mr. Clock, when they arrive at the college, it's only 7-30. Thus it is the real boon for collegians and they wish it a long life.

But sometimes Mr. Clock becomes angry with the students. It wants to teach them a lesson for being late daily. Being infuriated, it begins to work very fast. Consequently the watches of the students lag behind and they reach the college rather late. They are in great dismay to learn that their first period has gone. Next day they come earlier. Now Mr. Clock is in its ecstatic joy and laughs at the students heartily.

Strictly speaking, our Mr. Clock rarely keeps right time. In other words, it always keeps its own Local time and never compiles with standard time. Very often, it is allowed to have tree will but 'Shadi' sometimes sets it right, not by some other watch as you may think but by his own postulation. If he surmises that it's 8 O' clock, even though it may be 10 O'clock, he will make the clock strike nine without any hesitation.

At times, we come in the morning and see that the clock is slow by 20 minutes and the first period begins in compliance with this tims. But during the third period, someone sets it right and the period is over only after the lapse of 15 minutes, every period being 35 minutes. The professors are wonderstruck but willy-nilly they have to leave the class. The students are, on such occasions, in the seventh heaven of delight for so short a period. What a good stroke of fortune!

Sometimes it does favour the professors, too. One day we were attending the third period of History and it so happend that the clock went still. It was, I remember, a foggy and frosty morning, so we wished the period to be over earlier than usual, go to our houses, switch on the heater and warm ourselves. Moreover, we were dejected to listen to the lecture on 'Growth of Congress'

(*Continued on page 43*)

Rana Khalid Rashid

Importance of Logic

Valid thought can be attained only by the application of the principles of Logic. The Methods and inferences of every science depend upon the principles of logic, which is itself the most general of all sciences and is called the science of sciences. It is interesting to note that the name of Logic occurs with the names of almost all branches of science, e.g., Zoology, Geology, Physiology, Biology, Minerology, Sociology, Psychology, Theology ; logy=logic is at the top of all sciences.

Now let us come to the use of Logic. Some people say that the study of Logic is useless because even those who have never studied logic can reason correctly, while those who have studied Logic may not be able to reason correctly at all times. But this is a silly objection. It is just like saying that because we can live healthy without any knowledge of the science of medicine it is useless to study it. It is true that we can do without science so long as we are healthy ; similarly, it is true that we can do without the science of Logic so long as we reason correctly ; but when we fall ill, we have to consult a doctor who knows the science of medicine ; similarly, when we fall into error, we have to depend upon Logic to detect the cause of the error and to find out how correct reasoning can be achieved. Of course, we can, and often do, reason correctly with the help of our commonsense which is itself a kind of natural Logic in us. But commonsense is really very uncommon : Man is fallible ! to err is human, and there is much need of the science of Logic in ourlife.

So the fact that people can reason correctly without the help of Logic does not be-little the importance of Logic. People did not break their heads by violating the law of gravitation, or before the science of Hygiene or Physiology was discovered people did not delay their digestion. But who will ever say that a knowledge of the laws of gravitation and digesion is useless because men have been and still are able to live without it.

Logic is also positively valuable in these ways. It sharpens our intellects, develops our reasoning ability, and strengthens our understanding. It affords an excellent exercise for our intellectual powers, and is thus a good mental gymnastic. It helps us to from a critical habit of mind, and thus saves us from being deceived by another's clever arguing. It leads us to observe the laws of correct thinking, and thus saves us from error and confusions in our own reasoning. But it must not for one moment be supposed that after the study of Logic we can never commit mistakes in our thoughts. Logic cannot make us infallible. Just as doctors can fall ill although they have studied the science of medicine, so those who have studied Logic can commit mistakes in their thoughts, too.

Another useful thing is that other sciences give us information not formation ; they teach us what to think, not how to think. But Logic forms our mind instead of informing. The purpose of true education is not to learn different facts, but it lies in the mental discipline which results from them, and Logic fulfils this purpose admirably well. The possession of a logical mind is the noblest treasure that a man can have.

The utility of Logic is also very great in the study of other sciences. Every science involves more or less valid thinking, and thus observes the general principles of valid thinking which are given by logic. Hence we can call logic "The light of all Sciences" or the science of sciences as mentioned earlier.

Logic is also useful in our every day social intercourse. We often apply unaware the principles of Logic in our everyday arguments. But if we have carefully studied logic and have thorough grasp of the principles of correct thinking, we can, by an appeal to reason, convince others and persuade them to believe in the truth of what we hold on strictly logical grounds. Thus, Logic is also a very useful art for practical purposes.

For one word a man is often deemed to be wise and for one word he is often deemed to be foolish.

Khalil Ahmad Nasir

TREES

Trees are useful to man in three very important ways : they provide him with wood and other products they give him shade, and they prevent drought and floods.

Unfortunately, in many parts of the world, man has not realized that the third of these services is the most important. In his eagerness to draw quick profit from the trees he has cut them down in large numbers.

Two thousand years ago a rich and powerful country cut down its trees to build warships, with which to gain itself an empire. It gained its empire but without trees. The nation fell to pieces when it found itself faced with floods and starvation.

Where a government realizes the importance of plentiful supply of trees, it is difficult to persuade villagers to see this. The villagers want wood for money and for fuel They are usually too lazy and and careless to plant and look after new trees.

This does not mean that the villagers sons and grandsons have fewer trees. The results are even more serious, for where there are trees the soil breaks and allows water to sink into the soil and also binds the soil' thus preventing its being washed away easily ; but where there are no trees the rain falls on hard gounds and flows away on the surface causing floods and carry away the rich top-soil, in which crops grow well. When all the top soil is gone, nothing remains but worthless desert. So to prevent floods and starvation in your country start planting trees.

If you think you are too old for growing pains, try cultivating a small garden. *(Wall Street Journal)*

DISCOVER FIGI

Fiji offers you not only the main Island of Viti levu with its well known resorts and attractions but a great number of outer islands varying in size from tiny coral palm-fringed atolls to large volcanic islands covered with dense tropical jungles. There are over 300 island in the Fiji Group scattered over 100,000 square miles of pacific ocean. They Present a wealth of scenery and variety of interest unsurpassed anywhere in the Pacific.

The island of Vanua levu is next in size to Viti levu and in descending order of size. There are Khadanu, Taveuni Gan Kora, Ovolau and a Host of others. All different and yet each inhabited by the same friendly people the Fijians.

Transport to the other islands has improved over the years and to day visitors can enjoy leisurely cruising on small inter island freighters, or they may choose tourist cruises especially catering from visitors, or again they may be sped from island to island by the aircraft of Fiji Internal Airline.

There are airstrips at Savusauer and labasa and Vanua Levu, Matai and Un and Iaveuni. An amphibian aircraft maintains a twice weekly service to Levuka on the Island of Ovalau and to Kadavu. Or may be charted for flights to any part of the group.

The outer islands of Fiji are ideal for the visitor who wishes to leave worries of civilization behind and enjoy a relaxing holiday off the beaten track.

Here are some places to visit and see things.

1. High up in the mountains of Taveuni at the height of over 2000 ft is a fresh water lake distinguished for its floating islands. Going round its bank can be found the beautiful Fiji maueia, a variety of orchid found no where else in the world.

The Sawau tribesmen of the island of Bega performs the ancient

ceremony of firewalking, which to this day defies all scientific explanations. Unlike the Indian ceremonies on the main Islands which are of a religious significance, Fijian firewalking is an initiation ceremony, Youngmen of Particular districts of of Bega show their manhood by walking on hot stones.

A great deal of preparations precedes the ceremony. The initiat- are segregated for a long period before their fire-walk. Timber has to be cut stones. vines and leaves to be gathered and the special colour costumes made. On the day of fire-walking the fire prepared in a big pit is lit and the huge logs burnt for some eight or nine hours before the white hot stones are raked to a smooth surface. At a call from the leader, the fire walkers run out of their hut and walk over the hot stone within the circle of the pit. When their walk is over the rest of the party, with loud cries and chants throw bundles of leaves in firepit and fire the newly intiated of the stones.

At levuka, on the island of Ovalau, and attractive lane shaded by cocoanut palm and breadfruits leads up the hill side to a swimming pool fed from a sparking stream which tumbles down amid the trees. Originally the capital of Fiji, was selected for its harbour, which give easy access to sailing ships. I evuka is new quiet but a picturesque backwater, rich with history. It has a good hotel (The Royal) and is ideal for a holiday. It was here that the Deed of Cession, giving of Fiji Islands to Great Britain was signed by Fijian Chiefs.

The Yasaw Islands, which are one of the most unspoiled areas of the Pacific. Stretch like a sparkling neck-lace on the breast of the Pacific to the West of the Viti Levu. They are within sight of Nadi Airport and Lautoka. A weekly cruise takes visitors to these islands, where they can enjoy fishing and swimming, witness solemn Fijian ceremonies and enjoy magnificient scenery in an area rarely visited by any other vessel and where customs and culture of old Fiji are carefully preserved.